سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اور انسانی حقوق

حضرت مولانا ابو عمار
زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور انسانی حقوق

حضرت مولانا ابوعمار

زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی

گوجرانوالہ، پاکستان

www.alsharia.org

جملہ حقوق محفوظ!

عنوان	:	سیرۃ النبی ﷺ اور انسانی حقوق
تالیف	:	ابو عمار زاہد الراشدی
ضبط و تحریر	:	حافظ کامران حیدر
عنوانات و ترتیب	:	ناصر الدین خان عامر
ناشر	:	الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ
اشاعت	:	اگست ۲۰۲۳ء

فہرس

پیش لفظ

سیرۃ النبی ﷺ اور انسانی حقوق ۱۰

حقوق اللہ اور حقوق العباد ۱۰

حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کی غلامی ۱۲

حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کا واقعہ ۱۳

- حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ترتیب ۱۴

- حضرت سلمان فارسیؓ کی نصیحت ۱۵

- نمازِ فجر کے بعد حضورؐ کی مجلس میں ۱۵

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا واقعہ ۱۶

مغیثؓ اور بریرہؓ کا واقعہ ۱۷

سیرۃ النبی ﷺ اور معاشرتی حقوق ۲۰

معاشرتی حقوق کی ترتیب ۲۰

(۱) گھر والوں کے حقوق ۲۱

(۲) رشتہ داروں کے حقوق ۲۱

(۳) پڑوسیوں کے حقوق ۲۱

(۴) معاشرے کے حقوق ۲۲

جانوروں کے حقوق ۲۳

راستے کے حقوق ۲۴
نیکی کی تلقین اور برائی سے ممانعت کا حق ۲۵
ایک دوسرے کا لحاظ کرنے کا حق ۲۶
سیرۃ النبی ﷺ اور معاشی حقوق ۲۷
(۱) گھر کا دائرہ ۲۷
- والدین کی ذمہ داری ۲۷
- اولاد کی ذمہ داری ۲۸
- میاں بیوی کی تقسیم کار ۲۸
(۲) معاشرے کا دائرہ ۲۹
- سائل اور محروم کا حق ۲۹
(۳) ریاست کا دائرہ ۳۰
- مقروض اور لاوارث کا ذمہ ۳۱
- حضورؐ کی خوش طبعی کے دو واقعات ۳۲
سیرۃ النبی ﷺ اور پڑوسیوں کے حقوق ۳۴
پڑوس کی حد ۳۴
پڑوسیوں کی غذائی ضرورت کا خیال ۳۴
پڑوسیوں کو اپنی شرارتوں سے محفوظ رکھنے کی تلقین ۳۵
بلا امتیازِ مذہب پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک ۳۶
سیرۃ النبی ﷺ اور مزدوروں کے حقوق ۳۸
مزدور کسے کہتے ہیں؟ ۳۸
مزدوری، انبیاء کرامؑ کی سنت ۳۹

مزدور کا حق کیا ہے؟ ۴۱

جبر کی ممانعت ۴۱

- حضرت ابو مسعود انصاریؓ کا واقعہ ۴۱

- حضرت ابو ذر غفاریؓ کا طرزِ عمل ۴۲

سیرۃ النبی ﷺ اور مسافروں کے حقوق ۴۳

حضرت ابو ذر غفاریؓ کا واقعہ ۴۳

- شعب ابی طالب کا حصار اور حضرت علیؓ کی مہمان نوازی ۴۳

- قبولِ اسلام اور قریش کا ردِ عمل ۴۵

حضرت ابو سعید خدریؓ کا واقعہ ۴۷

اصحابِ صفہ اور حضرت ابو ہریرہؓ کا واقعہ ۴۹

سیرۃ النبی ﷺ اور غیر مسلموں کے حقوق ۵۱

(۱) محارب کفار ۵۱

(۲) غیر محارب کفار ۵۲

(۳) منافقین ۵۳

سیرۃ النبی ﷺ اور افسروں کے حقوق ۵۷

(۱) عاملین کا حق الخدمت ۵۷

- حضرت عمرؓ کی روایت ۵۷

- حضرت عقبہ بن عامرؓ کا سوال ۵۸

(۲) عاملین کا احتساب ۵۹

- سرکاری دوروں پر موصول ہونے والے تحائف ۵۹

- سرکاری فرائض کے دوران ذاتی کاروبار ۶۰

(۳)عاملین کا دفاع ۶۰
- حضرت خالد بن ولیدؓ کا دفاع ۶۱
- حضرت اسامہ بن زیدؓ کا دفاع ۶۱
- حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا دفاع ۶۲

سیرۃ النبی ﷺ اور مہمانوں کے حقوق ۶۴

عمرہ کا پہلا سفر ۶۴
نبی کریمؐ اور مہمان نوازی ۶۵
حضرت علیؓ کی مہمان نوازی ۶۵
مہمان کا اکرام ۶۶
میزبان کا لحاظ ۶۶
حضرت جابرؓ کا دسترخوان ۶۸
حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کی مہمان نوازی ۷۰
مہمان کے سامان کا دھیان ۷۰

سیرۃ النبی ﷺ اور قیدیوں کے حقوق ۷۲

غزوہ بدر کے قیدی ۷۲
غزوہ حنین کے قیدی ۷۳
غزوہ مریسیع کے قیدی ۷۴
قیدیوں کا تبادلہ ۷۴
قیدیوں کیلئے پناہ ۷۵

سیرۃ النبی ﷺ اور غلاموں کے حقوق ۷۷

دورِ نبویؐ میں غلامی کا رواج ۷۷

(۱) آزاد آدمی کی غلامی ۷۷
(۲) تاوان اور قرضے کی غلامی ۷۸
(۳) جنگی قیدیوں کی غلامی ۸۰
مسئلہ غلامی اور اسلامی تعلیمات ۸۱
غلامی آج کے دور میں ۸۳
حالاتِ زمانہ اور اسلامی احکام ۸۴

سیرۃ النبی ﷺ اور دعوتِ اسلام ۸۶

اعلانِ نبوت کا حکم ۸۶
اسلام اور عالمگیریت ۸۷
قرآن کریم، دعوت کا اولین ذریعہ ۸۸
پازیٹو اور نیگیٹو کا جھانسہ ۹۰
قرآن کریم میں ردوبدل کا مطالبہ ۹۰
ردوبدل کی اتھارٹی کون؟ ۹۱
مصائب وتشدد کے مراحل ۹۲
اوس اور خزرج کی دعوت ۹۲
ہرقل قیصر روم اور حضرت سفیانؓ کا واقعہ ۹۴
''یاایھا الناس'' کی ذمہ داری ۹۶

پیش لفظ

نحمدہ تبارک وتعالٰی ونصلی ونسلم علٰی رسولہ الکریم وعلٰی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین.

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں مختلف موضوعات پر فکری نشستوں کا سلسلہ شروع سے چلتا آ رہا ہے اور متعدد عنوانات پر ان نشستوں میں گفتگو ہو چکی ہے۔

۲۰۱۸ء کے دوران ان نشستوں کا عنوان ''سیرت نبویؐ اور انسانی حقوق'' تھا جس کے مختلف پہلوؤں پر گزارشات پیش کی گئیں۔ الشریعہ اکادمی کے لائبریرین مولانا حافظ کامران حیدر نے انہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا جبکہ میرے چھوٹے فرزند حافظ ناصرالدین خان عامر نے نظر ثانی کے بعد اسے زیر نظر کتابچہ کی شکل دی ہے، اور اسے قارئین کی خدمت میں اس دعا کی درخواست کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالٰی اس کاوش کو قبول فرمائیں اور ہم سب کے لیے توشۂ آخرت بنا دیں، آمین یارب العالمین۔

ابوعمار زاہدالراشدی
ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ
۷ ستمبر ۲۰۲۰ء

سیرۃ النبی ﷺ اور انسانی حقوق

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ گزشتہ سال کی فکری نشستوں میں وہ نمایاں شخصیات جن کے ساتھ میں نے وقت گزارا ان کا تذکرہ ہوا، اس سال ان فکری نشستوں کا موضوع یہ ہے کہ انسانی معاشرت، سوسائٹی اور سماج کے حوالے سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کیا ہے؟ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کیا ہے؟ حضورؐ کا معمول کیا رہا ہے؟ اس کے مختلف پہلوؤں پر بات ہوگی۔ آج کا موضوع ہے ’’سیرۃ النبیؐ اور انسانی حقوق‘‘ کہ انسانوں کے باہمی حقوق کے بارے میں آپؐ کا طرز عمل کیا تھا؟ آج کی دنیا میں انسانی حقوق سب سے بڑا موضوع ہے اور یہ آج کی دنیا میں بات کہنے کا ایک بڑا ہتھیار بھی ہے، بالخصوص اس حوالے سے کہ آپ جب بھی دنیا کے کسی کونے میں اسلامی شریعت کی بات کرتے ہیں تو اسے انسانی حقوق کے خلاف کہہ دیا جاتا ہے، وہ الگ موضوع ہے لیکن سرِ دست میں اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ انسانی حقوق ہیں کیا؟ اور جناب نبی کریمؐ کا اسوۂ حسنہ کیا ہے؟

حقوق اللہ اور حقوق العباد

انسانی حقوق کے بارے میں اسلام کا تصور یہ ہے کہ ہماری اصطلاح ’’حقوق اللہ اور حقوق العباد‘‘ کے عنوان سے ہے۔ قرآن کریم نے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی بات کی ہے کہ اللہ کا حق کیا ہے؟ اور بندوں کا حق کیا ہے؟ جبکہ مغرب کی اصطلاح ’’انسانی حقوق‘‘ کی ہے، مغرب خدا کے حقوق کی بات نہیں کرتا، ان کے ہاں خدا کا تصور ہو یا نہ ہو ایک ہی بات ہے، خدا کا کوئی حق ہے یا نہیں ہے ایک ہی بات ہے۔ ہمارے نزدیک پہلا حق اللہ کا ہے، اس کے بعد بندوں کے حقوق

ہیں۔قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہ ترتیب بیان کی ہے کہ حقوق اللہ بھی ہیں اور حقوق العباد بھی ہیں۔ ابھی سورۃ الماعون کی تلاوت ہوئی ہے، اس میں چار حق بیان ہوئے ہیں۔ایک اللہ کا اور تین بندوں کے۔یتیم کو دھتکارنا، یہ کام کافر کرتا ہے مسلمان کا یہ کام نہیں، جو دین (قیامت) کو جھٹلاتا ہے وہ ہی یتیموں کو دھکے دیتا ہے، ایماندار اور دیندار آدمی یتیم کو دھکے نہیں دیتا۔ یہ بندوں کے حق کا ذکر ہوا۔ مسکین اور محتاج کو کھانا کھلانا، یہ بھی بندوں کا حق ہے۔اس کے بعد نماز کا ذکر ہے کہ نماز اللہ کا حق ہے۔نماز نہ پڑھنا اللہ کی حق تلفی ہے۔نماز میں سستی کرنا اللہ کی حق تلفی ہے۔اس کے بعد فرمایا"**ویمنعون الماعون**" (سورہ الماعون ۷) آپس میں استعمال کی چیزیں ایک دوسرے کو دینی چاہئیں، یہ بھی انسانی حقوق میں سے ہے۔میں نے خلاصہ بیان کیا کہ اس چھوٹی سی سورت میں بھی اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کے حقوق کا ذکر فرمایا ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا۔

اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق قرآن کریم میں اور بھی بہت سے مقامات پر ذکر فرمائے گئے ہیں۔ایک اور آیت پڑھ دیتا ہوں جس میں اللہ رب العزت نے ترتیب سے ذکر فرمایا ہے کہ حقوق اللہ کیا ہیں اور حقوق العباد کیا ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے"**وعبدوا اللّٰہ ولا تشرکوا بہ شیئًا وبالوالدین احسانًا وبذی القربٰی والیتامٰی والمساکین والجار ذی القربٰی والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وماملکت ایمانکم**" (سورہ النساء ۳۶)۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حقوق کے دس دائرے بیان کیے ہیں جن میں پہلا حق اپنا بیان کیا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور نو حق بندوں کے بیان کیے ہیں۔ ان کو دائروں میں تقسیم کر کے پہلے والدین کا حق بیان کیا کہ ان کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آؤ، پھر قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریبی پڑوسیوں، وہ پڑوسی جو رشتہ دار نہیں ہے "**صاحب بالجنب**"، سبق کا ساتھی، سفر کا ساتھی، کمرے کا ساتھی وغیرہ، اور مسافروں اور غلاموں کے حقوق درجہ بدرجہ بیان فرمائے ہیں۔حقوق میں پہلا حق اللہ کا بیان ہوا، پھر نو حق بندوں کے ذکر ہوئے۔ آج لوگ بندوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں لیکن پہلا حق اللہ کا ہے۔ بڑی تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو بیان فرمایا۔ یہاں قریبی رشتہ داروں سے حسن سلوک کی بات

ہوئی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے ”وآت ذالقربی حقه والمسکین وابن السبیل“ (سورہ الاسراء ۲۶) قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرو، یہ تمہارا احسان نہیں ان کا حق ہے، مسکین اور مسافر پر خرچ کرو، یہ تمہارا احسان نہیں ہے ان کا حق ہے۔

ایک بات میں نے یہ کہی ہے کہ ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی بات کرتے ہیں، اور اتنی تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دوسرا قانون اس تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کرتا مگر ہم قرآن اس لیے پڑھتے ہی نہیں کہ یہ ہم سے کہتا کیا ہے، ہم تو ثواب اور برکت کے لیے پڑھتے ہیں اور وہ ہمیں مل جاتی ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ حقوق کے حوالے سے کیا ہے؟ اس پر بیسیوں احادیث ہیں، دو ذکر کروں گا۔ حقوق کے حوالے سے بخاری شریف میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حقوق کے بارے میں حضورؐ کی سنت اور ذوق کیا ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کا واقعہ ہے۔ آپ پہلے مجوسی تھے، پھر عیسائی ہوئے، ایک طویل عرصہ عیسائی رہے، پھر یہودیوں کے ایک خاندان کے غلام بنے اور کافی عرصہ غلامی کا گزارا، کہتے ہیں کہ باری باری دس مالکوں کے پاس رہا ہوں۔ مدینہ منورہ میں یہودیوں کے غلام کے طور پر آئے تھے لیکن یہ غلامی تو آپ کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی، آپ کی قسمت کہ ادھر سے یہ مدینہ پہنچے اور ادھر سے حضورؐ قبا میں تشریف لے آئے، اور پھر انہوں نے اپنی آزادی خریدی۔

حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کی غلامی

میں کہا کرتا ہوں کہ دو آدمیوں کے لیے غلامی اللہ کی بہت بڑی نعمت کا سبب بنی، جیسے حضرت یوسفؑ کے لیے غلامی بادشاہت کا ذریعہ بنی تھی، اسی طرح حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کے لیے۔ زید بن حارثہؓ غلام بن کر مکہ آئے تھے اور پھر اس مقام پر پہنچے کہ حضورؐ نے ابو زید کہلانا شروع کر دیا تھا۔ اور حضرت سلمان فارسی بھی یہودیوں کے غلام بن کر مدینہ منورہ آئے تھے۔ اسی وجہ سے مدینہ میں رہتے ہوئے بدر اور احد میں شریک نہیں ہو سکے، البتہ آزاد ہونے کے بعد غزوۂ خندق میں شریک ہوئے تھے اور خندق انہی کے مشورے سے کھودی گئی تھی۔

حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کا واقعہ

حضرت سلمان فارسیؓ جب مدینہ منورہ آئے تو مہاجر تھے، جناب نبی کریمؐ نے حضرت ابوالدرداءؓ سے ان کی مواخات کرادی، جیسے حضورؐ کا مواخات کرانے کا معمول تھا۔ باہر سے آنے والے سینکڑوں ہزاروں لوگ ہوں اور ایک آدمی کو ایک خاندان سنبھال لے، یہ تو آسان ہے، اور سب کے لیے اکٹھا انتظام کرنا بہت مشکل ہے۔ حضورؐ نے بڑی حکمت عملی سے ایک مہاجر اور ایک انصاری کو بھائی بھائی بنا دیا۔

حضرت سلمان فارسیؓ کو حضرت ابوالدرداءؓ کے حوالے کر دیا۔ حضرت ابوالدرداءؓ نوجوان آدمی تھے اور حضرت سلمان فارسیؓ عمر رسیدہ تھے، آپؓ کی عمر کے بارے میں اڑھائی سو سال کی بھی روایت ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے جو محتاط روایت ذکر کی ہے وہ ایک ۱۸۰ سال کی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جب آپ مسلمان ہوئے تو ڈیڑھ سو سال کے تھے اور جہاندیدہ آدمی تھے، کئی مذہب بھگتے ہوئے تھے۔ حضرت ابوالدرداءؓ آپ کو اپنے گھر لے کر گئے، وہاں جا کر حضرت سلمان فارسیؓ نے دیکھا کہ گھر میں گھر والی کوئی بات نہیں ہے۔ ام الدرداءؓ کو دیکھا کہ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، گھر کی کوئی صفائی نہیں ہے۔ حالانکہ عورت گھر میں ہو تو گھر کی حالت سے پتہ چلتا ہے کہ اس گھر میں کوئی عورت رہتی ہے۔ وہ مکان کو صاف رکھے گی، پردے لٹکائے گی، زیب و زینت کا اہتمام کرے گی، یہ عورت کی فطرت ہے، لیکن وہاں تو گھر والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ نے جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ام الدرداءؓ سے بات کی اور کہا کہ یہ اپنا کیا حال بنا رکھا ہے، نہ ڈھنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، اور گھر کیا حال کر رکھا ہے، کوئی چیز سلیقے سے نہیں رکھی ہوئی۔ ام الدرداءؓ نے جواب دیا کہ بھائی جان! بات یہ ہے کہ عورت سنورتی بھی ہے، گھر کو سنوارتی بھی ہے لیکن کسی کے لیے سنورتی اور سنوارتی ہے۔ آپ کے بھائی کو کسی بات سے دلچسپی ہی نہیں ہے، میں بھی گزارا کر رہی ہوں، وہ بھی گزارا کر رہے ہیں۔ یہ پہلی بات حضرت سلمان فارسیؓ نے اس گھر میں نوٹ کی۔ دوپہر کا وقت ہوا تو حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے لیے دستر خوان بچھایا اور کھانا لگایا اور کہا لیجیے کھانا کھائیے۔ انہوں نے کہا تم بھی آؤ

میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ ابوالدرداءؓ نے کہا میرا تو روزہ ہے، میں ہمیشہ روزہ رکھتا ہوں۔ انہوں نے دوبارہ کہا آؤ میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو۔ ابوالدرداءؓ نے پھر انکار دیا کہ میرا روزہ ہے۔ اس پر حضرت سلمان فارسیؓ نے کہا اچھا ٹھیک ہے، دسترخوان اٹھالو میں بھی نہیں کھاتا، تم کھاؤ گے تو میں کھاؤں گا۔ اب حضرت ابوالدرداءؓ مجبور ہو گئے کیونکہ مہمان کے سامنے سے دسترخوان کیسے اٹھاتے! لہٰذا حضرت ابوالدرداءؓ کو روزہ توڑنا پڑا اور حضرت سلمان فارسیؓ کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے، اور شرعی مسئلہ بھی یہی ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ترتیب

یہاں میں ایک اصول عرض کروں گا کہ حقوق اللہ بھی ضروری ہیں اور حقوق العباد بھی ضروری ہیں، لیکن دونوں کی ترتیب یہ ہے کہ فرائض و واجبات میں حقوق اللہ مقدم ہیں، جبکہ مباحات اور مستحبات میں حقوق العباد مقدم ہیں۔ فقہاء یہ مسئلہ لکھتے ہیں کہ فرض روزہ کسی کے لیے بھی توڑنا جائز نہیں، جبکہ نفلی روزہ مہمان کے اکرام میں توڑنا پڑے تو توڑ دیں اور پھر اس کی قضاء کریں کہ مہمان کا حق زیادہ ہے۔ چنانچہ حضرت ابوالدرداءؓ روزہ توڑ کر مہمان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے، حضرت سلمان فارسیؓ نے یہ دوسرا کام کیا کہ ان کا روزہ تڑوایا۔ رات کو سونے کا وقت ہوا تو حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ کو بستر بچھا کر دیا کہ آپ آرام فرمائیں۔ انہوں نے پوچھا تمہارا کیا پروگرام ہے؟ کہا، میں تو ساری رات نفل پڑھتا ہوں، رات کو سوتا نہیں ہوں، عبادت کرتا ہوں۔ فرمایا، بستر لاؤ اور میرے ساتھ آرام کرو۔ انہوں نے کہا حضرت! یہ میرا معمول نہیں ہے۔ فرمایا، معمول ہے یا نہیں بستر ادھر لاؤ اور آرام کرو۔ مجبوراً ان کو بستر پر لیٹنا پڑا۔ درمیان میں ایک بات کہتا ہوں کہ حضرت سلمان فارسیؓ حضرت ابوالدرداءؓ کے بڑے بھائی بنائے گئے تھے اور بڑا بھائی تو بڑا بھائی ہی ہوتا ہے، بڑے بھائی کا دبکا مشہور ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ خود کہتے ہیں، میں یہ سوچ کر لیٹ گیا کہ تھوڑی دیر بعد جب حضرت سلمان فارسیؓ سو جائیں گے تو میں اٹھ کر مصلّے پر چلا جاؤں گا۔ تھوڑی دیر بعد اٹھنے کی کوشش کی تو حضرت سلمان فارسیؓ جاگ رہے تھے، کہنے لگے کدھر جا رہے ہو؟ آرام سے سو جاؤ۔ صبح سحری کے وقت حضرت سلمان فارسیؓ اٹھے، مجھے بھی اٹھایا کہ یہ

وقت ہے عبادت کا، اٹھو تم بھی نفل پڑھو، میں بھی پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد پروگرام یہ بنا کہ فجر کی نماز مسجد نبوی میں جا کر آنحضرتؐ کے پیچھے پڑھیں گے۔ مسجد جانے لگے تو حضرت سلمان فارسیؓ نے حضرت ابوالدرداءؓ کو ایک نصیحت کی۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی نصیحت

میں کہا کرتا ہوں کہ اسلام کے فلسفہ حقوق کی بنیاد حضرت سلمان فارسیؓ کی اس نصیحت پر ہے۔ انہوں نے حضرت ابوالدرداء کو مخاطب کر کے فرمایا ”ان لربک علیک حقًا ولنفسک علیک حقًا ولزوجک علیک حقًا ولزورک علیک حقًا فاعط کل ذی حق حقه“ تیرے رب کے تجھ پر حقوق ہیں، تیری جان کے تجھ پر حقوق ہیں، تیری بیوی کے تجھ پر حقوق ہیں، تیرے مہمان کے تجھ پر حقوق ہیں، دین یہ ہے کہ ”فاعط کل ذی حق حقه“ ہر حق والے کو اس کا حق وقت پر ادا کرو۔ اللہ کے حق کے وقت میں اللہ کا حق، جان کے حق کے وقت میں جان کا حق، کھانا پینا سونا وغیرہ یہ جان کے حق ہیں، بیوی کے حق کے وقت میں بیوی کا حق، اور مہمان کے حق کے وقت میں مہمان کا حق۔ ہر حق والے کو اس کا حق اس کے وقت پر ادا کرو، یہ ہے دین۔ یہ نصیحت کی اور اور پھر دونوں بھائی جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ فجر کی نماز مسجد نبوی میں آنحضرتؐ کے پیچھے ادا کی۔

نمازِ فجر کے بعد حضورؐ کی مجلس میں

نماز فجر کے بعد حضورؐ کا معمول یہ ہوتا تھا کہ مقتدیوں کی طرف رخ کر کے بیٹھتے تھے، اشراق کے وقت تک بیٹھے رہتے تھے۔ یہ متفرق کاموں کی مجلس ہوتی تھی، اسے میں آج کی اصطلاح کے حوالے سے کھلی کچہری کہا کرتا ہوں۔ کوئی متعین کام نہیں ہوتا تھا، کوئی نئی وحی آئی ہوتی تو اس وقت سنا دیتے، کسی نے خواب دیکھا ہوتا تو اس کی تعبیر پوچھ لیتا، کوئی مہمان آیا ہے تو اس کا حال احوال پوچھ لیا جاتا، کوئی خاص ہدایات دینی ہوتیں تو وہ دے دیتے، اور سمرۃ بن جندبؓ کہتے ہیں کہ کوئی اور کام نہیں ہوتا تھا تو ہم گپ شپ کرتے رہتے تھے۔ اشراق تک یہ مجلس ہوتی تھی، اس کے بعد آپؐ گھر تشریف لے جاتے تھے، بلکہ بسا اوقات حضورؐ خود پوچھتے تھے کسی نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا۔

ایسے ہی اس دن حضورؐ مقتدیوں کی طرف متوجہ ہوئے تو حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کو دیکھا تو ان کو بلا لیا۔ حضرت ابوالدرداءؓ سے پوچھا، بھائی کیسا لگا؟ آپس میں مزاج ملا؟ حضرت ابوادرداءؓ پچھلے ایک دن سے بھرے بیٹھے تھے، موقع ملتے ہی ساری کارگزاری سنا دی کہ یارسول اللہ! انہوں نے جاتے ہی میری بیوی سے انٹرویو کیا، پھر میرا روزہ تڑوادیا، رات کو مجھے نفل نہیں پڑھنے دیے، مجھ سے زبردستی نیند کروائی، صبح کو یہ نصیحت کی اور ہم یہاں آ گئے ہیں۔ اس پر جناب نبی کریمؐ نے ایک جملہ کہا "**صدق سلمان**"۔ صدق فعل پر بھی لگتا ہے اور قول پر بھی لگتا ہے۔ مطلب یہ کہ سلمان نے جو کیا ہے ٹھیک کیا ہے اور جو کہا ہے ٹھیک کہا ہے۔ اس سے پہلے یہ جملے حضرت سلمانؓ کی نصیحت تھی "**ان لربک علیک حقًا ولنفسک علیک حقًا ولزوجک علیک حقًا ولزورک علیک حقًا فاعط کل ذی حق حقہ**"۔ لیکن حضورؐ کے "صدق سلمان" کہنے سے یہ جملے مرفوع حدیث ہو گئے ہیں۔

یہ جناب نبی کریمؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ اللہ کے حق کے لیے بندوں کے حق نہ مارو، اور بندوں کے حق کے لیے اللہ کا حق نہ مارو، ہر ایک کا حق ادا کرو۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اسلام میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بنیاد قرآن کریم کی "**واعبدوا اللّٰہ ولا تشرکوا بہ شیئًا**" والی آیت ہے اور سلمان فارسیؓ کے یہ جملے ہیں، اور اس میں بھی ترتیب وہی ہے کہ پہلے حقوق اللہ کا ذکر ہے پھر حقوق العباد کا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا واقعہ

ایک اور روایت ذکر کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ حق کا شعور کیا ہوتا ہے اور حق کا یہ احساس و شعور کس نے پیش کیا۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، مجلس لگی ہوئی تھی، آپ کی دائیں جانب حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے ہوئے تھے جو حضورؐ کے چچازاد بھائی ہیں اور شاگرد ہیں، ایک رشتے میں بھانجے بھی لگتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ ان کی حقیقی خالہ ہیں۔ جبکہ حضورؐ کی بائیں جانب حضرت صدیق اکبرؓ بیٹھے ہوئے تھے جو کہ اکبر الصحابۃ، افضل الصحابۃ ہیں۔ مجلس میں حضورؐ کو پیالے میں کوئی مشروب پیش کیا گیا۔ حضورؐ نے نوش فرمایا، آخر میں کچھ گھونٹ بچ

گئے یا بچا لیے، اب یہ کسی کو دینے تھے۔ حضورؐ کے بیان کردہ قانون کے مطابق یہ دائیں والے کا حق بنتا ہے ''**الایمن فالایمن**'' اور دائیں طرف ایک تیرہ چودہ سال کا لڑکا بیٹھا ہوا تھا، یعنی عبداللہ بن عباسؓ جو کہ حضورؐ کی وفات کے وقت پندرہ سال کے تھے۔ حق ان کا بنتا تھا مگر جی چاہ رہا تھا بائیں طرف دینے کو، تو جناب نبی کریمؐ نے عبداللہؓ سے اجازت مانگی کہ عبداللہ! اجازت ہو تو بائیں طرف دے دوں۔ وہ بھی عبداللہؓ تھے، کہا، یا رسول اللہ! یہ آپ کا تبرک ہے، اس میں کسی کو میں اپنے اوپر ترجیح نہیں دیتا، یہ میرا حق ہے مجھے دیجیے۔ عبداللہؓ نے حضورؐ کو اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ دیکھیں کہ حق کا شعور کیسے کہتے ہیں، روایت کے الفاظ یہ ہیں ''**فتلّـه فی یدہٖ**'' حضورؐ نے زور سے تھمایا اس کے ہاتھ میں کہ لے پکڑ۔ حضورؐ کا جی بائیں جانب دینے کو چاہ رہا تھا، اجازت مانگی تو اجازت نہیں ملی، غصہ بھی آیا، پیالہ دیا بھی غصے سے، لیکن دیا اسی کو ہے جس کا حق تھا۔ یہ آپؐ کا اسوہ ہے کہ جس کا حق ہے اسی کو ملنا چاہیے۔ وہ اجازت دے تو دوسرا لے سکتا ہے، وہ اجازت نہ دے تو کوئی دوسرا نہیں لے سکتا۔

مغیثؓ اور بریرہؓ کا واقعہ

ایک اور روایت ذکر کر دیتا ہوں، بخاری شریف کی روایت ہے جو ''حدیث بریرہ'' کہلاتی ہے۔ بریرہؓ ایک خاندان کی لونڈی تھیں۔ خاندان والوں نے مغیثؓ نامی نوجوان سے ان کی شادی کر دی۔ مالک اپنی لونڈی کی کہیں شادی کر دے اس کا حق ہے۔ بریرہؓ نے خاندان والوں سے بات کی کہ اگر تم میرا سودا کر لو، میری قیمت طے کر و تو میں تمہیں قیمت محنت مزدوری کر کے دے دیتی ہوں، جسے فقہی اصطلاح میں مکاتبت کہتے ہیں۔ انہوں نے بات منظور کر لی اور نو اوقیہ طے ہوئے نو قسطوں میں۔ بریرہؓ نے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں جا کر عرض کیا، اماں جان! یہ میرا سودا ہوا ہے، میرے ساتھ کچھ تعاون کیجیے تا کہ مجھے آزادی مل جائے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا بیٹا اگر میں ساری قسطیں اپنی طرف سے دے کر تمہیں خرید لوں اور تمہیں آزاد کر دوں، یہ سودا تمہارے خاندان والوں کو منظور ہے؟ ان سے بات کر لو میں یکبارگی سارے پیسے دے دیتی ہوں اور تمہیں آزاد میں کروں گی۔ حضرت عائشہؓ نے خرید کر آزاد کر دیا، اب وہ حضرت عائشہؓ کی خادمہ بن گئیں۔ آزاد

ہونے کے ساتھ ہی ان کو ایک اور حق حاصل ہو گیا جسے ''خیارِ عتق'' کہتے ہیں۔ نکاح کے وقت آزاد بالغ عورت کو تو انکار کا اختیار ہوتا ہے لیکن لونڈی کو یہ اختیار نہیں ہوتا۔ مالک نے لونڈی کا اپنی مرضی سے کہیں نکاح کر دیا ہو، لونڈی جب آزاد ہوتی ہے تو اس کا وہ حق بحال ہو جاتا ہے، اب اس کی مرضی ہے کہ خاوند کے ساتھ رہے یا نہ رہے۔ بریرہؓ جب آزاد ہوئیں تو وہ سمجھدار تھیں اور مسئلہ مسائل جانتی تھیں، انہوں نے مغیثؓ کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا کہ اب ہمارا نکاح ختم۔ مغیثؓ صاحب بہت پریشان ہوئے کہ یہ کیا ہوا اور کہا کہ ایسا نہ کرو، لیکن بریرہؓ نے کہا یہ میرا حق ہے اور میں نے اپنا حق استعمال کر لیا ہے۔ مغیثؓ بہت زیادہ پریشان ہوئے، کچھ دن تو سفارشیں بھیجتے رہے، لیکن بریرہؓ نے کسی کی سفارش نہ مانی۔

ایک دن آنحضرتؐ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ساتھ مدینہ منورہ کے کسی محلے سے گزر رہے تھے تو مغیثؓ کو دیکھا کہ گلیوں میں دیوانہ وار پھر رہا ہے، آنسو بہہ رہے ہیں اور روتے ہوئے آوازیں دے رہا ہے، کوئی اللہ کا بندہ ہے جو بریرہ کو منا دے، میرا گھر اجڑ گیا ہے۔ حضورؐ نے ساتھی سے کہا کہ اس بیچارے کا حال دیکھو یہ اس کے پیچھے دیوانہ ہو گیا ہے، اور وہ اس کا نام بھی نہیں سننا چاہتی۔ اللہ کی قدرت ہے اللہ کے کاموں میں کون دخل دے۔ یہ منظر دیکھ کر جناب نبی کریمؐ کو مغیثؓ پر ترس آیا اور آپؐ نے مغیثؓ کی سفارش کرنے کا فیصلہ کیا اور ایسے وقت میں سفارش کرنی بھی چاہیے۔ میں کہا کرتا ہوں ایسے وقت میں کسی کی سفارش کرنا سنت ہے، کسی کی ایسی حالت ہو جائے تو اسے دھکے نہیں مارنے چاہئیں بلکہ سفارش کرنی چاہیے۔ آپؐ نے سفارش کا فیصلہ کیا اور گھر تشریف لائے۔ بریرہؓ کو بلایا اور فرمایا مغیثؓ کا کیا قصہ ہے؟ انہوں نے کہا، یارسول اللہ میں نے اپنا حق استعمال کیا ہے اور مغیثؓ کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا ہے۔ آپؐ نے سفارش کرنا چاہی تو بریرہؓ نے کہا، یارسول اللہ! کیا یہ میرا حق نہیں تھا؟ فرمایا، حق تو تھا۔ کہا، اب میری مرضی میں اس کے ساتھ رہوں یا نہ رہوں۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ جناب نبی کریمؐ نے بریرہؓ سے کہا، بریرہ! کوئی نظر ثانی کی گنجائش ہے تو نظر ثانی کر لو، اس بیچارے کا بہت برا حال ہے۔ یہاں آپ حضرات ذرا غور کریں کہ سفارش کون کر رہا ہے اور کس سے سفارش کر رہا ہے۔ آنحضرتؐ خود سفارش کر رہے ہیں گھر کی خادمہ سے۔ فرمایا، بریرہ! یہ فیصلہ واپس لے سکتی ہو؟ وہ بھی حضرت

عائشہ کی شاگرد تھی، کہا یا رسول اللہ! یہ آپ حکم فرما رہے ہیں یا مشورہ دے رہے ہیں؟ یہ فرق وہ جانتی تھی کہ حکم کا درجہ کیا ہوتا ہے اور مشورے کا درجہ کیا ہوتا ہے۔ اگر آپؐ حکم دے دیں تو کس مسلمان کی مجال ہے کہ اس کا انکار کر سکے، اور مشورہ ہو تو اس میں اختیار ہوتا ہے کہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ حضورؐ نے فرمایا، حکم نہیں ہے مشورہ ہے۔ یہ سنا تو فوراً بولی **"لاحاجۃ لی"** مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس موقع پر کانپ جاتا ہوں کہ کون انکار کر رہا ہے اور کس کے سامنے کر رہا ہے۔ مگر اسی پر قصہ ختم ہو گیا۔ یہ ہے حق کا احساس۔ آج دنیا میں عورتوں اور بچوں کے حقوق کا شور مچا ہوا ہے، بچوں کے حق کی بات اور عورتوں کے حق کی بات، یہ بات آپ حضرات کی سمجھ میں آئی ہے کہ سب سے پہلے یہ حقوق کس نے پیش کیے ہیں؟

آج میں نے قرآن کریم کی دو آیتیں اور آپؐ کی سیرت مبارکہ کے بیسیوں واقعات میں سے دو واقعے ذکر کیے ہیں کہ حقوق کے بارے میں قرآن کریم کا تصور اور مزاج کیا ہے اور حضورؐ کا مزاج اور سنت مبارکہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

سیرۃ النبی ﷺ اور معاشرتی حقوق

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ انسان دنیا کی جاندار چیزوں میں سے وہ مخلوق ہے جو اکٹھے مل جل کر زندگی گزارتے ہیں۔ تمدن، محلے، بستیاں، مکانات، شہر، ریاستیں، حکومتیں کسی اور مخلوق میں نہیں ہیں۔ یہ سسٹم نہ شیروں میں ہے، نہ ہاتھیوں میں ہے۔ تمدن یعنی مل جل کر رہنا، ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرنا، یہ صرف انسانوں میں ہے، اگرچہ دوسرے جاندار بھی یہ کرتے ہیں لیکن محدود دائرے میں۔ تمدن کو معاشرت بھی کہتے ہیں اور یہ انسان کا خاصہ ہے۔ ایک عام لفظ بولا جاتا ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے، انسان میں مدنیت، شہریت، اجتماعیت، معاشرت ہوتی ہے، اور اکٹھے رہنا انسان کی مجبوری بھی ہے، انسان کی ضرورت بھی ہے اور انسان کی عادت بھی ہے۔ اکٹھے رہنے کے لیے ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھنا اور ایک دوسرے کی ذمہ داریاں پوری کرنا ضروری ہے۔ جہاں چند آدمی اکٹھے رہتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے کا لحاظ رکھنا پڑے گا، ایک دوسرے کی بات سننی پڑے گی، ایک دوسرے کا کام کرنا پڑے گا، ایک دوسرے سے کام لینا پڑے گا۔ اس کو معاشرت، تمدن اور سماج کہتے ہیں۔

معاشرتی حقوق کی ترتیب

اسلام تمدن اور سماج کا مذہب ہے۔ نبی کریمؐ نے آپس کے جو حقوق بیان کیے ان کی ترتیب یہ ہے کہ:

(۱) گھر والوں کے حقوق

آپؐ نے سب سے پہلے گھر والوں کے حقوق بیان کیے ہیں، اولاد کے لیے ماں باپ کے حقوق، والدین کے لیے اولاد کے حقوق، بھائیوں کے لیے بہنوں کے حقوق، بہنوں کے لیے بھائیوں کے حقوق، خاوندوں کے لیے بیویوں کے حقوق، بیویوں کے لیے خاوندوں کے حقوق اور پھر دوسرے قریبی رشتہ داروں کے حقوق۔ قرآن کریم نے حقوق اس ترتیب سے بیان کیے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "**اٰت ذا القربی حقه**" (سورہ الاسراء ۲۶) سب سے پہلا حق ماں باپ، اولاد، بیوی بچوں اور بہن بھائیوں کا ہے۔

(۲) رشتہ داروں کے حقوق

اس کے بعد دوسرے قریبی رشتہ داروں کا حق بیان کیا ہے اور اسے "**حقه**" کہہ کر بیان کیا ہے کہ قریبی رشتہ داروں کو بھی ان کے حقوق درجہ بدرجہ ادا کرو، اس کو صلہ رحمی کہتے ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صلہ رحمی دوہری عبادت ہے۔ ویسے خرچ کرنا صدقہ ہے اور رشتہ داروں پر خرچ کرنا دوہرا صدقہ ہے کہ اس میں صدقہ کے ساتھ صلہ رحمی بھی ہے۔

(۳) پڑوسیوں کے حقوق

اس کے بعد جناب نبی کریمؐ نے تیسرا دائرہ پڑوسیوں کا، اردگرد رہنے والوں کا بیان فرمایا۔ "**والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب**" (سورہ النساء ۳۶)۔ یہ تین قسم کے پڑوسی بیان کیے ہیں، ایک وہ پڑوسی جو رشتہ دار بھی ہیں، دوسرے وہ پڑوسی جو رشتہ دار نہیں ہیں، اور تیسرے پہلو کا ساتھی جسے کولیگ کہتے ہیں، جیسے کلاس فیلو، سفر کا ساتھی، کسی کام میں شریک، ملازمت میں ساتھ کام کرنے والا۔ یہ تیسرا دائرہ پڑوسیوں کا ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب نبی کریمؐ نے پڑوسیوں کے حقوق بیان کیے کہ پڑوسیوں کا لحاظ رکھا کرو، حتیٰ کہ اگر گھر میں کوئی اچھی چیز پکائی ہے تو پڑوسیوں کو بھی دو، کہتی ہیں میں نے پوچھا پڑوس کی حد کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، چاروں اطراف سے دس دس گھر۔ عرض کیا چالیس گھروں میں بھجوانے کے لیے کھانا تو میرے پاس نہیں ہوتا۔ فرمایا، اس گھر میں بھیجو جس کا دروازہ

تمہارے دروازے سے زیادہ قریب ہو۔ پڑوسیوں کے حقوق میں یہ بات ہے کہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو، خوشی، غمی میں شریک ہو، ایک دوسرے کی ضرورت میں کام آئے۔

آج کل ہمارا حال یہ ہے جدید سوسائٹی (پوش کالونیوں) میں تو پڑوسی کا پتہ نہیں ہوتا کہ کون ہے، جب تک اس گھر میں خوشی غمی کا موقع نہ آئے، کئی کئی سال تک کوئی خبر نہیں ہوتی کہ ساتھ کون رہتا ہے، بلکہ شادیاں بھی آج کل شادی ہالوں میں ہوتی ہیں حالانکہ ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا "**لیس المؤمن الذی یبیت شبعان وجارہ جائع فی جنبہ وھو یعلمہ**" جس کا پڑوسی اس کے پڑوس میں رات بھوکا سویا ہے، اس کو معلوم ہے اور یہ خود پیٹ بھر کے سویا ہے، فرمایا اس کو مومن کہلانے کا حق نہیں ہے۔

(۴) معاشرے کے حقوق

اس کے بعد چوتھا دائرہ ہے سوسائٹی کا کہ عمومی معاشرے میں جو محتاج اور ضرورت مند ہیں ان کا خیال رکھا جائے۔ کوئی معذور ہے، کوئی مصیبت زدہ ہے، کوئی پریشان حال ہے تو ان کے حقوق ادا کیے جائیں۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا "**وفی اموالھم حق للسائل والمحروم**" (سورہ الذاریات ۱۹) جو مال میں نے تمہیں دیا ہے وہ سارا صرف تمہارا نہیں ہے اس میں دوسروں کا بھی حصہ اور حق ہے سائل کا بھی اور محروم کا بھی۔ سائل سے مراد وہ ضرورت مند ہے جو اپنی ضرورت کا خود اظہار کرے، سائل سے مراد وہ سوالی نہیں ہیں جو گلیوں میں مانگتے پھرتے ہیں۔ جبکہ محروم سے مراد وہ ہے جو ضرورت مند تو ہے لیکن مانگتا نہیں ہے۔ معاشرے میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں، ہمارے اردگرد ہوتے ہیں جو ضرورت مند ہوتے ہیں لیکن شرم و حیا کی وجہ سے، اپنے عزت و وقار کی وجہ سے ہاتھ نہیں پھیلاتے، ایسے لوگوں کو سفید پوش کہا جاتا ہے کہ بظاہر دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہے، کپڑے اچھے پہنے ہوئے ہیں، مگر اندر کا حال یا وہ جانتا ہے یا خدا جانتا ہے۔ اس کا بھی حق ہے کہ اس پر خرچ کیا جائے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو مانگتا ہی نہیں ہے، اپنی ضرورت کا اظہار ہی نہیں کرتا، اس کو کیسے پہچانیں گے کہ اس کو اس کا حق دیا جاسکے۔ قرآن کریم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ "**تعرفھم بسیمٰھم لایسئلون الناس الحافا**" (سورہ البقرہ

۲۷۳)۔ سمجھدار آدمی علامتوں سے، اس کے حالات و معمولات سے پہچان لیتا ہے، اور ان کی یہ بھی نشانی ہے کہ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ یعنی سوسائٹی کے وہ افراد جو اپنی ضروریات کا اظہار کرتے ہیں، ان کا بھی تم پر حق ہے اور جو افراد باوجود محتاج ہونے کے اپنی ضروریات کا اظہار نہیں کرتے ان کا بھی تم پر حق ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے ایک اور فریضہ بھی عائد ہو جاتا ہے کہ اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھنا کہ کون کس کیفیت میں ہے۔ یہ بھی مسلمان کی ذمہ داری ہے۔

میں نے عرض کیا کہ پہلا درجہ اپنے اہل خانہ کا ہے۔ دوسرا درجہ برادری، رشتہ دار، قبیلہ کا ہے۔ تیسرا درجہ پڑوسیوں کا ہے اور چوتھا درجہ سوسائٹی کا ہے۔ قرآن کریم نے تفصیل اور ترتیب کے ساتھ حقوق بیان کیے ہیں۔ یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں، مسافروں اور غلاموں کے حقوق درجہ بدرجہ بیان کیے اور یہ فرمایا کہ یہ تمہارا احسان نہیں ہے بلکہ ان کا حق ہے "**وآت ذا القربیٰ حقہ والمسکین وابن السبیل**" (سورہ الاسراء ۲۶)۔

جانوروں کے حقوق

آنحضرتؐ نے جانوروں کے حقوق بھی بیان فرمائے ہیں۔ اس زمانے میں اونٹ، گھوڑے اور خچر کی سواری ہوتی تھی، اگر کوئی سوار حضورؐ کے پاس آتا تو حضورؐ پوچھتے تھے سواری کدھر ہے اسے کہاں باندھا ہے؟ ایک مرتبہ آپؐ مسجد میں تھے ایک آدمی آیا، اس نے اونٹ باہر چھوڑا اور خود مسجد میں آ گیا، سلام عرض کیا آپؐ نے اس سے پوچھا کیسے آئے ہو؟ عرض کیا اونٹ پر۔ فرمایا اونٹ کدھر ہے؟ عرض کیا یارسول اللہ! اللہ کے توکل پر باہر چھوڑ دیا ہے۔ فرمایا، نہیں! جا کر پہلے اونٹ کے پاؤں باندھو پھر توکل کرو۔ میزبان کی ذمہ داری ہے کہ پہلے مہمان کے جانور کے چارے کا اور اس کے آرام کا اہتمام کرے۔ حضورؐ اس کا خیال کیا کرتے تھے۔ آج کل مثلاً اگر مہمان موٹر سائیکل یا گاڑی پر آیا ہے تو اس سے پوچھنا چاہیے کہ موٹر سائیکل، گاڑی کہاں کھڑی کی ہے، محفوظ جگہ پر کھڑی کی ہے؟ یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن یہ بھی حقوق میں شامل ہیں۔

راستے کے حقوق

لوگ آج انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں جناب نبی کریمؐ نے تو راستے کا حق بھی بیان فرمایا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ راستے میں مت بیٹھا کرو جہاں لوگ آ جا رہے ہوں، وہاں بیٹھ کر مجلس مت لگاؤ، اس سے آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہؐ "**ما لنا بدّ**" مجبوری ہوتی ہے کوئی ساتھی ملنے کے لیے آ گیا اور گھر میں بیٹھنے کی جگہ نہ ہو تو باہر گلی میں ہی بیٹھنا پڑتا ہے۔ اگر کسی مسئلے میں کوئی مجبوری ہوتی تھی تو صحابہؓ عرض کر دیا کرتے تھے کہ یارسول اللہ یہ مجبوری ہے اور حضورؐ مجبوری کا حل بتاتے تھے یا کسی کا بتایا ہوا حل قبول فرماتے تھے۔ مثلاً حضورؐ نے خیبر کے موقع پر پالتو گدھے کی حرمت کا اعلان فرمایا اور حکم فرمایا "**اھر یقوھا و اکسروھا**" ہنڈیا الٹا دو اور توڑ دو جس میں گدھے کا گوشت پک رہا ہے۔ اس پر ایک صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ کیا دھونے سے کام چل نہیں جائے گا؟ گوشت پھینک دیتے ہیں لیکن ہنڈیا کی پھر بھی ضرورت پڑے گی تو آپؐ نے اجازت فرما دی کہ ہنڈیا دھو لو۔ اسی طرح جب صحابہؓ نے کہا راستے میں بیٹھنا ہی پڑتا ہے تو آپؐ نے فرمایا "**اعطوا الطریق حقه**" اگر راستے میں مجلس لگانا ہی پڑتی ہے تو پھر راستے کا حق ادا کرو۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ! کیا راستے کا بھی کوئی حق ہوتا ہے؟ "**ما حق الطریق؟**" گلی اور سڑک کا کیا حق ہوتا ہے؟ آپؐ نے راستے کے یہ حقوق بیان کیے "**غضوا البصر**" تاک جھانک نہ کرو "**کفوا الاذی عن الطریق**" راستے میں کوئی تکلیف دہ چیز (روڑا، کیلے کا چھلکا وغیرہ) نظر آئے تو اسے ہٹا دو۔ گویا آنے جانے والوں کا حق ہے کہ ان کو تکلیف سے بچاؤ۔ اور فرمایا "**ردوا السلام**" سلام کہنے والے کو جواب دو۔ سلام کہنا اور سلام کا جواب دینا راستے کا مستقل حق ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، ان کے شاگرد ہیں امام التابعین حضرت نافعؒ۔ یہ کہتے ہیں کہ ایک دن ابن عمرؓ نے مجھے کہا، نافع! مجھے بازار لے جاؤ چکر لگانا ہے، کام ہے۔ میں ساتھ چل پڑا، بازار میں چلتے گئے چلتے گئے ایک جگہ جا کر فرمایا چلو واپس چلتے ہیں۔ نافعؒ نے عرض کیا، حضرت! آپ بازار میں کس کام آئے تھے؟ بازار میں آدمی خرید و فروخت کرتا ہے، آپ

نے تو کوئی خرید وفروخت نہیں کی۔فرمایا میں جس کام آیا تھا وہ کام کرلیا۔عرض کیا،حضرت میں بھی ساتھ ہی تھا،آپ نے کیا کام کیا ہے؟ فرمایا، بازار جاتے ہوئے کچھ لوگوں کو میں نے سلام کہا، انہوں نے جواب دیا، کچھ نے مجھے سلام کہا، میں نے جواب دیا، میں اسی کام کے لیے بازار آیا تھا کہ کافی عرصہ ہوا تھا میں گھر سے بازار نہیں آیا تھا اور راستے کا سلام جواب نہیں ہوا تھا جو کہ حضورؐ کی سنت ہے۔

نیکی کی تلقین اور برائی سے ممانعت کا حق

اسی طرح آنحضرتؐ نے راستے کا ایک یہ حق بیان کیا"**الامر بالمعروف والنھی عن المنکر**" نیکی کا حکم کرنا،نیکی کے کام میں کسی کو کوتاہی کرتے ہوئے دیکھ کر اسے تنبیہ کرنا اور برائی سے منع کرنا، یہ بھی راستے کے حقوق میں سے ہے۔

جناب نبی کریمؐ نے معاشرتی حقوق بیان فرمائے، اس کے میں نے کچھ دائرے بیان کیے ہیں، گھر، رشتہ دار، پڑوسی، عمومی سوسائٹی، راستہ اور سڑک وغیرہ۔ آپؐ نے حقوق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک دوسرے کی عزت و احترام کرو، کوئی ایسی بات یا ایسا کام نہ کرو بلکہ کوئی ایسا اشارہ بھی نہ کرو جس سے دوسرے کی توہین ہوتی ہو۔ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کا قد چھوٹا تھا، ایک دن ان کا ذکر ہوا تو ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے اشارہ کیا کہ وہ چھوٹے قد والی، زبان سے کچھ نہیں کہا۔اس پر حضورؐ سخت ناراض ہوئے کہ عائشہ کیا کر رہی ہو، ایسا کر کے اس کی توہین کر رہی ہو۔ اسی طرح طنز اور استہزا سے منع فرمایا، البتہ ہلکا پھلکا مزاح کرنے کی اجازت دی۔مزاح اور طنز میں فرق ہے، مزاح وہ ہے جس میں دوسرا محسوس کرے کہ میرے ساتھ دل لگی کی ہے، اور طنز یہ ہے کہ دوسرے کی عزت خراب ہوتی ہو اور وہ اس سے اپنی توہین محسوس کرے۔

دوسرے کی ضروریات کا خیال رکھنا بھی حقوق میں شامل ہے۔مثلاً مہمان آیا ہے، کھانے کا وقت ہو تو اسے کھانا کھلانا، چائے پلانا، حقہ نسوار دینا۔ ہمارے بنگلہ دیش کے ایک دوست مولانا شمس الدین قاسمیؒ تھے۔ایک دفعہ وہ مشرقی پاکستان سے میرے پاس بطور مہمان آئے، میں اپنی حیثیت کے مطابق ان کی مہمانی کرتا رہا۔ایک دو روز کے بعد کہنے لگے آپ نے ہماری مہمانی نہیں

کی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اپنی طرف سے تو پوری مہمانی کی ہے۔ میں نے پوچھا حضرت! کیا کمی رہ گئی ہے؟ کہنے لگے ارے بھائی! پان تو آپ نے کھلایا نہیں۔ چنانچہ مہمان کی ان ضروریات کا خیال کرنا بھی حقوق میں شامل ہے۔

ایک دوسرے کا لحاظ کرنے کا حق

جناب نبی کریمؐ نے حکم فرمایا کہ ایک دوسرے کو ترجیح دیا کرو۔ وہ مشہور واقعہ آپ نے کئی بار سنا ہوگا، یہاں بھی دیکھ لیں کہ حضورؐ نے ہمیں کیا معاشرت سکھلائی ہے، احد کی جنگ کے موقع پر پانی پلایا جا رہا تھا، ایک زخمی نے آواز دی پانی! اس کے پاس پانی لے کر پہنچے کہ ادھر سے دوسرے کی آواز آئی پانی! انہوں نے کہا، پہلے ان کو پلاؤ۔ وہ اس کے پاس پہنچے، ایک تیسرے کی آواز آئی پانی! انہوں نے کہا پہلے ان کو پلاؤ۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ شہید ہو گئے۔ اسی طرح تینوں نے جان دے دی۔ یہ ہے ایک دوسرے کا احساس، ایک دوسرے کی خوشی، غمی کو محسوس کرنا، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا۔ یہ معاشرتی بنیاد ہے جو قرآن کریم نے بیسیوں آیات میں بیان کی ہے اور جناب نبی کریمؐ نے سینکڑوں احادیث میں ارشاد فرمائی ہے۔

اصولی اور خلاصے کی بات یہ ہے کہ معاشرت کے آداب اور حقوق، ایک دوسرے کا لحاظ، ایک دوسرے کی عزت و احترام سب سے زیادہ قرآن کریم نے اور جناب نبی کریمؐ نے سکھایا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ جامع تعلیم جناب نبی کریمؐ نے دی ہے۔ ایک دوسرے کا لحاظ کرنے کی اس حد تک تلقین فرمائی کہ اگر تم گھر میں بچوں کے لیے کوئی پھل لائے ہو تو پھل کھا کر چھلکے دروازے سے باہر مت پھینکو کہ پڑوسی کے بچے دیکھیں گے اور گھر جا کر ضد کریں گے کہ ہم نے بھی کھانے ہیں۔ اگر ان کی حیثیت نہیں ہوئی تو وہ پریشان ہوں گے جس کا سبب تم بنے ہو، اب یا تو وہ بچوں کو ڈانٹ دیں گے یا خود کوئی غلط حرکت کریں گے۔ آپؐ نے یہ تلقین فرمائی کہ ایک دوسرے کے لیے اذیت اور تکلیف کا ذریعہ نہ بنو کہ یہ حق تلفی ہے۔

سیرۃ النبی ﷺ اور معاشی حقوق

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ معاشی حقوق کیا ہوتے ہیں اور معیشت کیا ہوتی ہے؟ انسان جب زندگی گزارتا ہے تو اسے اخراجات کے لیے اسباب کی ضرورت پڑتی ہے، پیسوں کی اور چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کی ضروریات شروع ہو جاتی ہیں اور اس کو جتنی بھی زندگی ملے آخر وقت تک یہ ضروریات باقی رہتی ہیں۔ یہ ضروریات اسباب سے ہی پوری ہوتی ہیں، جیب میں پیسے ہوں گے، خرچہ ہوگا تو ضروریات پوری ہوں گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مختلف دائرے بتائے ہیں۔

(۱) گھر کا دائرہ

پہلا دائرہ گھر کا ہے۔

والدین کی ذمہ داری

بچہ پیدا ہوا تو اس کی ضروریات پوری کرنا، کپڑے، دودھ، خوراک اور علاج وغیرہ اس کے والدین کے ذمہ ہے، ان کی حیثیت کے مطابق جب تک بچہ خود کمانے کے قبل نہ ہو جائے۔ قرآن کریم نے خرچے کا اصول بیان کیا "**علی الموسر قدرہ وعلی المقتر قدرہ**" (سورہ البقرہ ۲۳۶) مالدار آدمی پر اس کی حیثیت کے مطابق اور غریب آدمی پر اس کی حیثیت کے مطابق۔ والدین اپنی حیثیت کے مطابق خرچ نہیں کریں گے تو یہ زیادتی ہوگی، اور اگر اولاد ان کی حیثیت کو نہیں دیکھے گی اور زیادہ کا مطالبہ کرے گی تو یہ بھی زیادتی ہوگی۔ سمجھدار اولاد کو پتہ چل جاتا ہے کہ

ہمارے والدین کیا چیز مہیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ کہ اولاد کے جوان ہونے تک اس کی تمام ضروریات کھانا پینا، لباس و رہائش اور تعلیم و تربیت وغیرہ والدین کے ذمے ہیں۔

اولاد کی ذمہ داری

پھر ایک وقت آتا ہے جب والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں، کمانے کے قابل نہیں رہتے تو ان کا خرچہ اور ان کی خدمت اولاد کے ذمے ہو جاتی ہے، کیونکہ بچپن میں اولاد نے ان سے خدمت لی ہے اور خرچہ بھی ان کا اس پر ہوا ہے۔ بچہ خود دودھ پینے کے قابل نہیں ہوتا، فیڈر نہیں بھر سکتا، پیشاب کر دے تو کپڑے خود نہیں دھو سکتا، نہا نہیں سکتا۔ ایک وقت تک وہ اپنی ضروریات اور کام خود نہیں کر سکتا، سب کچھ والدین کرتے ہیں۔ اسی طرح ایسا ہی وقت ماں باپ پر آتا ہے جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو کھانا کھانے، کپڑے دھونے اور قضائے حاجت وغیرہ میں اولاد کے محتاج ہوتے ہیں، کمائی بھی وہ نہیں کر سکتے، تو یہ اولاد ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی ضروریات پوری کرے۔ اور جو قرآن مجید میں والدین کے لیے دعا سکھلائی گئی اس میں بھی یہی کہلوایا "**رب ارحمهما كما ربياني صغيرا**" (سورہ الاسراء ۲۴) کہ اے اللہ! جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پالا ان پر اسی طرح رحم فرما۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مجھے کس نے پالا تھا اور والدین کی خدمت کرنی چاہیے، یہ اولاد کا والدین پر احسان نہیں بلکہ اولاد پر والدین کا حق ہے۔

میاں بیوی کی تقسیم کار

اسی طرح میاں بیوی کے کاموں کی فطری طور پر تقسیم کر دی گئی ہے۔ گھر کے کام کاج کرنا، صفائی ستھرائی، کھانا بنانا، بچے پالنا وغیرہ بیوی کے کام ہیں، جبکہ خرچہ مہیا کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے۔ یہ تقسیم ہے کہ یہ کام بیوی نے کرنے ہیں اور یہ خاوند نے۔ آج ایک نیا فلسفہ شروع ہو گیا ہے کہ عورت گھر کے کام کاج بھی کرے اور ملازمت کر کے پیسے بھی کمائے۔ یہ نئی تہذیب ہے کہ عورت بچے بھی پالے اور خرچہ بھی پورا کرے۔ یہ عورت پر احسان ہے یا اس کے ساتھ زیادتی ہے؟ یہ لطیفے کی بات ہے کہ کہا جاتا ہے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینے چاہئیں، مرد ملازمت کرتا ہے تو عورت کو بھی ملازمت کرنی چاہیے، مولویوں نے عورتوں کو گھروں میں پابند کیا ہوا ہے۔

حالانکہ مساوات تو تب ہو کہ عورتوں کو اپنے کاموں میں شریک کرتے ہو تو ان کے کاموں میں بھی شریک ہو۔ ایک بچہ وہ جنے تو ایک تم جنو، ایک کو وہ پالے تو ایک کو تم پالو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طے کردہ فطری تقسیم ہے۔ کیا اللہ کی یہ تقسیم فطری نہیں ہے کہ بیوی کے سارے خرچے خاوند کے ذمے ہیں؟ مگر خاوند کی حیثیت کے مطابق۔

حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ ایک مثال سے سمجھایا کرتے تھے کہ نکاح ہوتے وقت خاوند سے پوچھا جاتا ہے ''قبول ہے؟'' وہ کہتا ہے قبول ہے۔ اس ''قبول ہے'' میں اس کے سارے معاملات شامل ہیں۔ بیوی کی ہر قسم کی ضروریات، کپڑا، کھانا، رہائش، علاج اور اس کی عزت و آبرو کی حفاظت سبھی چیزیں شامل ہیں۔ اگر کوئی کہے میں نے ''قبول ہے'' تو کہا تھا لیکن یہ چیزیں ذمہ نہیں لی تھیں، تو اسے بتایا جائے گا اس میں یہ سب کچھ شامل تھا اور تم نے یہ سب کچھ قبول کیا تھا۔ یہ مثال دے کر حضرت جالندھریؒ فرمایا کرتے تھے کہ اسی طرح جب ایک آدمی نے کلمہ طیبہ پڑھ لیا تو اس میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، معاملات، اخلاقیات سبھی چیزیں داخل ہیں۔ ہر ایک کا الگ الگ کہنا ضروری نہیں کہ میں یہ بھی کروں گا، یہ بھی کروں گا۔

بہرحال یہ گھر کا دائرہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے خرچے کی یہ تقسیم کی کہ بچپن میں اولاد کے خرچے ماں باپ کے ذمے، اور جب والدین بوڑھے ہو جائیں تو ان کے خرچے اولاد کے ذمے۔ بوڑھا ہو کر آدمی بچوں کی طرح ہی ضد کرنے لگتا ہے، اولاد کو حکم ہے جیسے انہوں نے تمہاری ضد پوری کی تھی تم بھی ان کی ضد پوری کرو۔ اور میاں بیوی میں کاموں کی بھی تقسیم کر دی کہ گھر کے کام عورت کے ذمے اور اخراجات مرد کے ذمے ہیں۔

(۲) معاشرے کا دائرہ

دوسرا دائرہ سوسائٹی اور معاشرے کا ہے۔

سائل اور محروم کا حق

اس کے بھی اللہ تعالیٰ نے حقوق بیان کیے ہیں کہ اپنے محلے میں، برادری میں نظر رکھو، کوئی غریب، مسکین، ضرورتمند ہے تو اس کی ضرورت پوری کرو۔ زکوٰۃ اور صدقات معاشرے کے

ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہیں۔ سو میں سے اڑھائی تو دینے ہی دینے ہیں، اس کے علاوہ بھی دو۔ یہ صدقات کن کو دینے ہیں؟ فرمایا ''اٰت ذا القربٰی حقه والمسکین وابن السبیل'' (سورہ الاسراء ۲۶) رشتہ داروں کا حق پہلے ہے، مسکین اور مسافر کو دینا بھی ان کا حق ہے۔ یہ تم ان پر احسان نہیں کر رہے، ان کا حق ان کو دے رہے ہو۔ یہ بات سمجھائی کہ تم محلے اور برادری میں کسی مستحق، معذور، غریب، بے سہارا پر خرچ کرتے ہو تو یہ تمہارا احسان نہیں ہے بلکہ یہ ان کا حق ہے جو تم ان کو دے رہے ہو۔ فرمایا ''وفی اموالهم حق للسائل والمحروم'' (سورہ الذاریات ۱۹) جو مال تمہیں دیے گئے ہیں وہ صرف تمہارے لیے نہیں بلکہ تمہارے مالوں میں سائل اور محروم کا بھی حق ہے۔

سائل سے مراد وہ ضرورتمند جو ضرورت کو ظاہر کرتا ہے، لیکن بعض ایسے ضرورت مند ہوتے ہیں جو غیرت کی وجہ سے اپنی ضرورت ظاہر نہیں کرتے، ہاتھ پھیلانا مناسب نہیں سمجھتے، ان کو قرآن کریم نے ''المحروم'' کہا ہے، ان کو سفید پوش کہا جاتا ہے۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو مانگتا ہے اور ضرورت ظاہر کرتا ہے اس کو تو دیا جائے، لیکن جو مانگتا ہی نہیں اور اپنی ضرورت کا اظہار ہی نہیں کرتا اس کو کیسے پہچانیں گے تاکہ اس کو اس کا حق دیا جاسکے۔ مفسرین فرماتے ہیں اس سے ایک اور فریضہ بھی عائد ہوجاتا ہے کہ اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھنا کہ کون کس کیفیت میں ہے یہ بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ پیچھا کرے اور مانگنے پر مجبور ہو تم خود ایسے آدمیوں کو تلاش کرو اور انہیں ان کا حق دو۔ یہ میں نے دوسرا دائرہ بیان کیا سوسائٹی کا کہ معاشرے میں جن کو اللہ تعالیٰ نے پیسے دیے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ضرورتمندوں کا خیال رکھیں، ان کی ضروریات پوری کریں۔

(۳) ریاست کا دائرہ

تیسرے درجے میں اگر کسی کا کوئی بھی سنبھالنے والا نہ ہو تو اس کی ذمہ داری ریاست اور حکومت پر ہے۔ اس پر میں ایک واقعہ بیان کروں گا۔

مقروض اور لاوارث کا ذمہ

بخاری شریف کی روایت ہے، جناب نبی کریمؐ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ کوئی مسلمان فوت ہوتا تو آپؐ جنازہ پڑھانے کے لیے تشریف لے جاتے اور پوچھتے کہ میت پر کسی کا قرضہ تو نہیں ہے؟ اگر کہا جاتا کہ نہیں ہے تو آپؐ جنازہ پڑھا دیتے۔ اور اگر کہا جاتا مقروض مرا ہے، تو پوچھتے کیا اتنی رقم یا جائیداد چھوڑ گیا ہے کہ اس کا قرضہ ادا ہو جائے؟ اگر کہا جاتا کہ جی! اتنی رقم چھوڑ کر مرا ہے تب بھی آپؐ جنازہ پڑھا دیتے۔ لیکن اگر جواب یہ ملتا کہ میت کی میراث سے اس کا قرضہ ادا نہیں ہو سکتا تو فرماتے "**صلوا علی صاحبکم**" تم جنازہ پڑھ لو، خود حضورؐ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے۔

ایک دفعہ ایسا ہی ہوا حضورؐ جنازہ کے لیے تشریف لائے، پوچھا اس پر قرضہ ہے؟ جواب ملا، جی ہے۔ پوچھا، کیا اتنی رقم چھوڑ گیا ہے کہ اس کا قرضہ ادا ہو جائے؟ جواب ملا، نہیں۔ آپؐ نے حسب معمول فرمایا "**صلوا علیٰ صاحبکم**" تم جنازہ پڑھ لو میں جا رہا ہوں۔ ایک صحابی ابوقتادہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہمارے اس بھائی کو جنازے سے محروم نہ کیجیے، اس کا جنازہ پڑھا دیں، اس کا قرضہ میرے ذمے رہا، میں ادا کر دوں گا۔ کیونکہ کسی مسلمان کے لیے اس سے زیادہ محرومی کیا ہو سکتی ہے کہ حضورؐ موجود ہوں اور اس کا جنازہ نہ پڑھائیں۔ اس سے زیادہ محرومی کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ قرضہ کا انتظام ہونے کے بعد آپؐ نے وہ جنازہ پڑھا دیا۔ اس موقع پر حضورؐ نے ایک اعلان فرمایا، میں اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا "**من ترک مالاً فلورثتہ و من ترک کلاً او ضیاعاً فالی وعلی**"۔ جو آدمی پیسے، جائیداد، مال چھوڑ کر مرے گا یہ مال اس کے وارثوں کو ملے گا ہم اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ اور جو کوئی بوجھ چھوڑ کر مرا ہے، قرضہ چھوڑ کر مرا ہے، یا ضیاعًا لاوارث بچے اور خاندان چھوڑ کر مرا ہے تو وہ میرے پاس آئیں گے اور میرے ذمے ہوں گے۔ یہاں سے فقہاء نے یہ اصول اخذ کیا کہ معاشرے کا ہر بے سہارا، ضرورتمند حکومت کے ذمے ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے باقاعدہ اس کا نظام قائم کیا۔

میں کہا کرتا ہوں کہ تاریخ میں پہلی بار یہ اعلان آنحضرتؐ نے کیا کہ جو بوجھ اور قرضہ یا لاوارث اولاد چھوڑ مرے گا وہ میرے پاس آئیں گے اور میرے ذمے ہوں گے۔ رسول اللہؐ نے بیت المال

اسی لیے قائم کیا تھا، لوگ آتے تھے اونٹ کی ضرورت ہوتی تو بیت المال سے دے دیتے، کسی کو کھجوریں ضرورت ہوتیں تو اسے بیت المال سے دے دیتے، مدینہ منورہ کا جو بھی ضرورتمند ہوتا حضورؐ کے پاس آتا، حضورؐ بیت المال سے کپڑے، خرچہ وغیرہ دے دیتے تھے۔

حضورؐ کی خوش طبعی کے دو واقعات

اسی پر ایک لطیفے کا قصہ بھی ہے کہ حضورؐ ہلکی پھلکی دل لگی بھی کیا کرتے تھے، خشک مزاج بزرگ نہیں تھے۔ ایک دفعہ ایک مسافر حاضر خدمت ہوا، عرض کیا یارسول اللہ! میں فلاں علاقے سے آیا ہوں، اب واپس جانا ہے لیکن میرا اونٹ مر گیا ہے، مجھے گھر پہنچنے کے لیے اونٹ چاہیے۔ اسے پتہ تھا کہ یہاں سے اونٹ مل جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا، بیٹھو تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ پریشان ہو گیا کہ میں اونٹنی کے بچے کو کیا کروں گا؟ میں اسے اٹھاؤں گا یا وہ مجھے اٹھائے گا۔ اس نے حضورؐ سے عرض کیا یارسول اللہ میں اونٹ کے بچے کو کیا کروں گا۔ تھوڑی دیر بعد حضورؐ نے بیت المال سے اونٹ منگوایا، اس کی مہار اس مسافر کو پکڑائی اور کہا، یہ بھی کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہے۔

جس طرح حضورؐ لوگوں سے دل لگی کرتے تھے اسی طرح بے تکلف ساتھی بھی آپؐ کے ساتھ دل لگی کیا کرتے تھے۔ ایک دلچسپ واقعہ عرض کرتا ہوں۔ حضرت نعیمانؓ بدری صحابی تھے، بڑے کھلی طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ لطیفے کرتے رہتے تھے، ان کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ ایک دن بازار سے گزر کر مسجد میں حضورؐ کے پاس جا رہے تھے کہ انگوروں کی ریڑھی دیکھی، کھانے کو دل چاہا تو مالک سے کہا، ایک صاع انگور دینا، میں حضورؐ کو چیک کراتا ہوں، اگر پسند آ گئے تو ہم کھالیں گے، اتنی دیر بعد مسجد میں آ کر پیسے لے جانا۔ انہوں نے انگور لیے اور مسجد پہنچے۔ وہاں حضورؐ اور صحابہؓ موجود تھے، ان سے جا کر کہا انگور کھائیں گے؟ انہوں نے کہا کھالیں گے۔ چنانچہ سب نے انگور کھائے، تھوڑی دیر کے بعد پیسے لینے والا آدمی آ گیا۔ حضرت نعیمان نے حضورؐ سے کہا یارسول اللہ! اس کو پیسے دیں۔ آپؐ نے فرمایا، کس چیز کے پیسے؟ حضرت نعیمانؓ نے کہا ابھی انگور نہیں کھائے؟ انگور کھائے ہیں تو اب پیسے دیں۔ چنانچہ حضورؐ نے پیسے دیے، پھر حضرت نعیمانؓ نے کہا میرا جی چاہ رہا تھا کہ آپ انگور کھائیں، میرے پاس پیسے نہیں تھے تو میں نے یہ طریقہ اختیار کیا تاکہ آپ انگور کھالیں کہ

ویسے تو آپ نے انگور کھانے نہیں تھے۔

میں نے یہ بات عرض کی ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں یہ ماحول تھا کہ جس کو جو چیز ضرورت ہوتی تھی بیت المال سے اس کو مل جاتی تھی۔ معاشرے کے ضرورتمندوں کی ضرورتیں آپؐ بیت المال سے پوری کیا کرتے تھے۔

یہ میں نے تین دائرے بیان کیے۔ گھر کی ضروریات اور خرچہ کی تفصیل بھی حضورؐ نے بیان فرمائی۔ بچے ماں باپ کے ذمے اور والدین اولاد کے ذمے۔ بیوی شوہر کے ذمے اور گھر کے سارے کام بیوی کے ذمے۔ دوسرے دائرے میں معاشرے کے امیروں کے ذمے لگا دیا کہ غریبوں اور محتاجوں کی ضروریات پوری کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اور تیسرا دائرہ کہ جس کا کوئی خیال نہ رکھنے والا ہو وہ حکومت اور ریاست کے کھاتے میں ہیں۔ جیسا کہ حکومتیں خلافت راشدہ کے دور میں ذمہ دار ہوا کرتی تھیں اور اپنی یہ ذمہ داری پوری کیا کرتی تھیں، اس پر بہت سے واقعات ہیں لیکن اب اتنا وقت نہیں ہے کہ بیان کیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ ایسا نظام نصیب فرما دے، آمین۔

سیرۃ النبی ﷺ اور پڑوسیوں کے حقوق

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے جو حقوق بیان فرمائے وہ اس طرح ہیں کہ ان کی خوشی غمی میں شریک ہوا جائے، ان کی بیمار پرسی کی جائے، حال احوال کی خبر رکھی جائے، ان کو نفع پہنچایا جائے، گھر میں کوئی چیز زیادہ پک گئی ہے یا زیادہ پکا لی جائے تو پڑوسیوں کو بھی اس میں شریک کیا جائے وغیرہ۔

پڑوس کی حد

ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا پڑوس کی حد کیا ہے؟ فرمایا چالیس گھر، چاروں اطراف میں دس دس گھر، یہ پڑوس کا دائرہ ہے۔ پھر پوچھا اتنے پڑوسیوں کو کون کھانا تقسیم کرے گا، سب سے پہلا حق کس کا ہے؟ فرمایا، جس کا دروازہ تمہارے دروازے سے زیادہ قریب ہے اس کا حق زیادہ ہے۔ پڑوس کی ایک اور حد بھی بیان کی گئی ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا، مسجد کے پڑوسی کی نماز بلا عذر مسجد کے سوا نہیں ہوتی۔ حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا، مسجد کے پڑوس کی حد کیا ہے؟ فرمایا، جہاں تک اذان کی آواز جاتی ہو وہ مسجد کا پڑوس ہے۔

پڑوسیوں کی غذائی ضرورت کا خیال

جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے **"لیس المؤمن الذی یبیت شبعان وجارہ جائع فی جنبہ وھو یعلم"** وہ آدمی مومن نہیں ہے جو خود تو پیٹ بھر کر سویا ہے مگر اس کا پڑوسی بھوکا سویا ہے اور اس کے علم میں ہے کہ پڑوسی کو رات کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ مومن نہیں ہے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ

کافر ہوگیا ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ مومنوں والا کام نہیں ہے، وہ کامل مومن نہیں ہے جو ایسا کرے۔

ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم گھر میں بچوں کے لیے کوئی پھل لائے ہو تو کھا کر چھلکے دروازے سے باہر مت پھینکو کہ پڑوسی کے بچے دیکھیں گے تو گھر جا کر ضد کریں گے کہ ہم نے بھی کھانے ہیں۔ اگر ان کی حیثیت نہیں ہے تو وہ پریشان ہوں گے اور پریشانی کا سبب تم بنے ہو۔ اب یا تو وہ بچوں کو ڈانٹ دیں گے یا قرضہ لیں گے، اس سے تمہارے پڑوسیوں کو تکلیف ہوگی۔ اگر تم ان کو دے نہیں سکتے تو ان کے سامنے اپنے بچوں کو نہ کھلاؤ۔ اتنی تکلیف دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ چنانچہ یہ پڑوسی کا حق بیان ہوا ہے کہ اگر اس کو نفع نہیں پہنچا سکتے تو کم از کم اس کو تکلیف سے محفوظ رکھو، کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے پڑوسی کو تکلیف ہوتی ہو۔

پڑوسیوں کو اپنی شرارتوں سے محفوظ رکھنے کی تلقین

پڑوس کا ایک حق تو یہ ہے کہ ان کو اپنی خوشی غمی میں شریک کریں، ان کی خوشی غمی میں شریک ہوں، ان کو جتنا نفع پہنچا سکتے ہیں پہنچائیں۔ اور ایک حق یہ ہے کہ پڑوسیوں کو اپنی شرارتوں سے محفوظ رکھیں۔ آپؐ نے فرمایا "**لیس المؤمن من لایأمن جارہ بوائقه**" وہ مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہے جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں، اذیتوں، تکلیفوں سے محفوظ نہیں ہے۔ پڑوسی کو کسی بھی ذریعے سے تکلیف پہنچانا منع ہے، اس کا راستہ روکنا بھی اس میں شامل ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے رسول اللہؐ سے شکایت کی میرا پڑوسی مجھے بہت تنگ کرتا ہے۔ آپؐ نے اس کو ایک حیلہ بتایا، فرمایا، گھر کا سامان باہر گلی میں رکھ دو اور یہ ظاہر کرو کہ میں محلّہ چھوڑ کر جا رہا ہوں، کوئی پوچھے تو بتاؤ کہ پڑوسی نہیں رہنے دیتا، تنگ کرتا ہے۔ اس نے ایسے ہی کیا، جب تین چار آدمیوں کو اس نے بتایا کہ پڑوسی تنگ کرتا ہے اس لیے میں جا رہا ہوں تو پڑوسی اس کے پاس آیا اور کہا یہیں رہو، میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔ پڑوس کے متعلق یہاں تک فرمایا کہ دیوار میں میخ بھی مت ٹھوکو، اس سے پڑوسی کو تکلیف ہوگی۔

ایک حدیث میں حضور نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا "**ما زال جبرئیل یوصینی بالجار**" جبریلؑ مسلسل وحی لے کر آتے رہے، اتنی بار پڑوسی کے بارے میں مجھے تلقین کی "**حتّٰی ظننت انه**

سیورثہ" مجھے گمان ہونے لگا کہ کہیں یہ حکم لے کر نہ آ جائیں کہ پڑوسی وراثت میں بھی شریک ہوتا ہے۔

بلا امتیازِ مذہب پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک

جناب نبی کریمؐ کا اپنا معمول کیسا تھا؟ آپؐ پڑوسیوں کا حال احوال پوچھتے، ان کی خوشی، غمی میں شریک ہوتے تھے، یہ دیکھے بغیر کہ مسلمان ہے یا نہیں۔ مسلمان یا کافر ہونا الگ مسئلہ ہے اور پڑوسی ہونا الگ مسئلہ ہے۔

آپؐ کے پڑوس میں ایک یہودی کا گھر تھا اس گھر کا ایک نوجوان لڑکا حضورؐ کی خدمت میں آتا جاتا تھا اور آپؐ سے محبت کرتا تھا۔ ایک بار وہ بیمار ہوا تو حضورؐ اس کی خبر لینے اس کے گھر تشریف لے گئے۔ اس کا آخری وقت تھا، آپؐ نے یہ محسوس کر لیا کہ اب اس کے آخری لمحات ہیں۔ کسی کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہی ہو سکتی ہے کہ اس کی آخرت میں نجات ہو جائے۔ آپؐ نے اس سے فرمایا، کلمہ پڑھ لو۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا کہ باپ کی اجازت ہے یا نہیں، باپ کا کیا ردعمل ہے؟ اس کے باپ کو علم تھا کہ بچے کو آپؐ سے محبت ہے، اس نے کہا "**اطع ابا القاسم**" ابوالقاسم جیسے کہتے ہیں کر لو۔ بچے نے کلمہ پڑھا اور ساتھ ہی فوت ہو گیا۔ یہ آپؐ کا پڑوس کے ساتھ رویہ تھا۔

ایک مسئلہ یاد رکھیں کہ مسلمان کافر کے معاملات الگ ہیں جبکہ انسانی ہمدردی، انسان کی عزت نفس اور انسان کے حقوق کا مستقل دائرہ ہے، اس کا نبی کریمؐ نے ہمیں غیر مسلموں کے معاشرے میں رہ کر درس دیا اور عملاً کر کے دکھلایا ہے۔ ایک دفعہ آپؐ تشریف فرما تھے، صحابہ کرامؓ بھی بیٹھے تھے کہ ایک جنازہ پاس سے گزرا۔ آپؐ احتراماً کھڑے ہو گئے کہ آپؐ کا حکم بھی یہ ہے کہ جب جنازہ گزر رہا ہو تو احترام میں کھڑے ہو جایا کرو۔ جب جنازہ گزر گیا تو صحابہؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! یہ تو یہودی کا جنازہ تھا، آپ نے فرمایا "**الیست نفسا؟**" کیا وہ انسان نہیں تھا؟

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ پڑوسی کوئی بھی ہو، مسلمان ہو یا کافر، بلا امتیاز تمام پڑوسیوں کے حقوق آپؐ نے بیان کیے کہ ان کی خوشی غمی میں شریک ہو، ان کو فائدہ پہنچاؤ، ان کو اپنے شر سے

بچاؤ۔ انسان کسی کو تنگ کر سکتا ہو اور تنگ نہ کرے تو حضورؐ نے اسے بھی صدقہ فرمایا ہے۔ ایک بار آپؐ نے صدقہ کی تلقین کی، ایک آدمی نے کہا اگر پاس کچھ نہ ہو تو کیا کریں۔ کچھ کما کر صدقہ کر دو۔ یہ بھی نہ کر سکیں تو؟ فرمایا، اس کو کوئی فائدہ پہنچاؤ۔ یہ بھی نہ کر سکیں تو؟ فرمایا، مسکرا کر ملنا بھی صدقہ ہے۔ یہ بھی نہ کر سکیں تو؟ فرمایا، اس کو اپنے شر سے بچاؤ، یہ بھی صدقہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں باہمی معاشرت میں ایک دوسرے کے حقوق صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

سیرۃ النبی ﷺ اور مزدوروں کے حقوق

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ ہماری آج کی نشست کا عنوان ہے ’’سیرۃ النبیؐ اور مزدوروں کے حقوق‘‘ اس حوالے سے دو تین اصولی باتیں عرض کروں گا۔

مزدور کسے کہتے ہیں؟

پہلی بات یہ کہ مزدور کسے کہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں کہ ہم آپس میں اشیا اور صلاحیتوں کا تبادلہ کرتے ہیں تو ہمارا نظام چلتا ہے۔ ہر آدمی اپنی ساری ضروریات خود پوری نہیں کر سکتا، کوئی ضرورت کوئی بندہ پوری کرتا ہے، دوسری ضرورت کوئی اور پوری کرتا ہے۔ ایک آدمی کہے کہ میں گھر بھی خود بنالوں گا، غلہ بھی خود اگالوں گا، دروازے بھی خود بنالوں گا، زمین سے پانی بھی خود نکال لوں گا، جانور بھی خود چرالوں گا، تو یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک آدھ کام خود کرے گا اور باقی کاموں میں دوسروں کی خدمت لے گا۔ انسان کی فطرت ہے کہ کسی کام میں، جو یہ جانتا ہے، دوسروں کا تعاون کرے گا اور دوسروں سے اپنے کاموں میں تعاون حاصل کرے گا۔ مثلاً ایک آدمی بکریاں چراتا ہے تو بکریاں چرانے کے کام میں تعاون کرے گا اور باقی کاموں میں تعاون لے گا۔ کسی سے غلہ لے گا، کسی سے کپڑے لے گا وغیرہ۔ تبادلہ اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون پر ہمارا سارا نظام چلتا ہے۔ اگر سارے لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ جائیں کہ ہم اپنا اپنا کام کریں تو کتنے دن تک گزارا کر لیں گے، چوبیس گھنٹے بھی اس کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا کہ ہمارا سارا نظام اس پر ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ تبادلے اور تعاون کی دو صورتیں ہیں:

☆ ایک ہے چیزوں کا تبادلہ، مثلاً دودھ دے دیا، غلہ لے لیا۔ پرانے زمانے میں دکانداری

زیادہ تر گندم اور مونجی پر چلتی تھی کہ دکان پر مونجی دے آئے اور دال لے آئے، باجرہ دے آئے اور مولیاں لے آئے، گندم دے آئے اور گڑ لے آئے۔ اب بھی دور دراز دیہات میں یہ چلتا ہے۔ کوئی چیز دے کر دوسری چیز لینے کو تجارت کہتے ہیں، اسی طرح پیسے دے کر چیز لینا بھی تجارت ہے کیونکہ پیسے بھی کسی چیز کے نمائندے ہیں۔

☆ دوسری صورت یہ کہ اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے اور میرے پاس اس کے عوض دینے کے لیے کوئی چیز یا پیسے نہیں ہیں تو میں کوئی خدمت ومحنت کروں گا اور اس کے عوض میں وہ چیز لوں گا۔ یہ ہے مزدوری، جیسے گندم کی کٹائی کرتے ہیں اور معاوضہ میں گندم لیتے ہیں۔ اجرت پر کام کرنا مزدوری ہے اور ساری دنیا کا دارومدار اس پر ہے۔

مزدوری، انبیاء کرامؑ کی سنت

دوسری بات یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سارے پیغمبر اپنے اپنے دور میں مزدور رہے ہیں۔ یہ حقیر پیشہ نہیں ہے، انبیاء کا پیشہ ہے۔ فرمایا، ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں، کوئی پیغمبر ایسا نہیں جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ موسٰی علیہ السلام نے دس سال حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرائیں اور پھر وہاں سے رشتہ بھی مل گیا تھا۔ انہوں نے جو آٹھ یا دس سال خدمت کی اور بکریاں چرائیں، یہ مزدوری تھی۔ اس کا مطلب یہ کہ ہر پیغمبر نے مزدوری کی۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ بکریاں چرانا بہت مشکل کام ہے اور بندوں کو چلانا اس سے بھی مشکل کام ہے۔ بھیڑیں چرانا آسان ہے کہ ایک بھیڑ کو جدھر لے جائیں باقی ساری اس کے پیچھے ہی آئیں گی، جبکہ بکریاں چر رہی ہوں تو ہر بکری علیحدہ رخ پر ہوگی۔ بیس بکریاں سنبھالنا مشکل ہوتا ہے اور سو بھیڑیں سنبھالنا آسان ہے۔ اللہ تعالٰی پیغمبروں کو پہلے بکریوں کی ٹریننگ کراتے ہیں تاکہ بندوں کو صحیح سنبھال سکیں کیونکہ بندوں کے مزاج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جب آپؐ نے یہ فرمایا کہ ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں تو ایک صحابی نے عرض کیا "**وانت یارسول اللّٰہ؟**" یارسول اللہ! آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں میں کئی سال مکہ میں فلاں قبیلے کے بکریاں چند پیسوں کے عوض چراتا رہا ہوں۔ گویا فرمایا یہ کوئی حقارت والا کام نہیں ہے، عزت والا

کام ہے۔

حضورؐ نے پیغمبروں کا سردار ہو کر مزدوری کی اور حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ ہو کر مزدوری کرتے رہے ہیں۔ وہ زرہیں بناتے تھے اور زرہوں کی کمائی پر گھر کا خرچہ چلتا تھا، شاہی خزانے سے لینا ان کا حق تھا لیکن وہ اس سے نہیں لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے بطور خاص ان کو ایک ہنر سکھایا تھا "علمنٰہ صنعة لبوس لکم لتحصنکم من باسکم" (سورہ الانبیاء ۸۰) ہم نے داؤدؑ کو زرہیں بنانا سکھایا تھا۔ زرہیں بنا کر بیچتے تھے اور گھر کا خرچہ چلاتے تھے۔ یعنی بنی اسرائیل کے بڑے خلیفہ حضرت داؤدؑ مزدوری کرتے رہے۔

جبکہ مسلمانوں کے بڑے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ بنے تو دوسرے دن کپڑوں کی گٹھری سر پر اٹھائی اور بیچنے بازار چل دیے۔ آپؓ پھیری لگایا کرتے تھے، کپڑا بنتے بھی تھے اور بیچتے بھی تھے۔ راستے میں حضرت عمرؓ ملے۔ پوچھا، حضرت! کدھر جا رہے ہیں؟ فرمایا کام پر جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا، آپ کام پر جائیں گے تو پیچھے مقدمے کون سنے گا؟ کسی ملک کا سفیر آ جائے تو وہ کس سے ملے گا؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا، اگر میں کام نہ کروں گا تو شام کو بچوں کو کیا کھلاؤں گا؟ حضرت عمرؓ نے کہا، میں اس کا حل نکالتا ہوں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے بڑے بڑے صحابہؓ کو اکٹھا کیا اور ان سے مشورہ کیا کہ اگر خلیفۃ المسلمین محنت و مزدوری کا کام کریں گے تو حکومت کے کام کون کرے گا اور اگر آپؓ حکومتی کاموں کے لیے یہاں بیٹھ جاتے ہیں تو وہ شام کو کھانا کہاں سے کھائیں گے؟ اس کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔ صحابہ کرام میں سے حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ یہ جب ہمارا کام کریں گے، امت کا کام کریں گے، تو ہم امت کے خزانے بیت المال میں سے انہیں تنخواہ دے دیا کریں گے۔ اس کو ملازمت کہتے ہیں، اس سے حکمران کی تنخواہ طے ہوگئی۔

انبیاء بھی مزدوری کرتے رہے ہیں، خلفاء بھی مزدوری کرتے رہے ہیں اور ہندوستان کے مغل بادشاہوں میں بڑے بادشاہ اورنگزیب گزرے ہیں، پچاس سال انہوں نے حکومت کی ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، برما، افغانستان، اور چین کا مغربی حصہ ان کے زیر نگیں تھا اور موبائل فون کے بغیر اس سارے علاقے پر اورنگزیب نے حکومت کی ہے کہ جہاں اطلاع ملے وہاں خود جانا پڑتا تھا۔ اگرچہ شاہی خزانہ تھا، مغلوں کے پاس بہت بڑی دولت تھی، لیکن اورنگزیب خود دو کام کرتے

تھے، ایک قرآن پاک لکھتے تھے اور اس کا معاوضہ لیتے تھے۔ میں نے اورنگزیب عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن کریم کا نسخہ لندن کے میوزیم میں دیکھا ہے، بڑا خوبصورت لکھتے تھے۔ (۲) اور دوسرا کام یہ کرتے کہ ٹوپیاں بناتے تھے اور بیچتے تھے۔ میں نے یہ بتایا کہ مزدوری کوئی حقارت کا کام نہیں ہے، یہ نبیوں، بادشاہوں اور خلفاء کا کام ہے۔

مزدور کا حق کیا ہے؟

تیسری بات یہ کہ مزدور کا حق کیا ہے؟ مزدور کا پہلا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ جو کچھ طے کیا ہے اس کو بروقت دیا جائے۔ بلاوجہ ٹال مٹول کرنا اس پر ظلم ہے، جبکہ پیسے لے کر کام پورا نہ کرنا یہ اُس کی طرف سے ظلم ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے "**اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ**" مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو، اس کو پھیرے نہ لگواؤ۔

جبر کی ممانعت

چوتھی بات یہ کہ آپؐ نے ہدایت دی کہ مزدور سے کام لو لیکن اس پر سختی، ظلم اور زیادتی نہ کرو۔ اس زمانے میں مزدور زیادہ تر غلام ہوتے تھے۔ جبکہ مزدور بھی ماتحت سمجھے جاتے ہیں "**تحت ایدیکم**"۔

حضرت ابومسعود انصاریؓ کا واقعہ

حضرت ابومسعود انصاریؓ کہتے ہیں، ایک دفعہ میری ایک لونڈی بکریاں چرا رہی تھی کہ کچھ دیر وہ بے پرواہ ہوگئی، اس کی بے پرواہی سے بھیڑیا آیا اور ایک بکری لے گیا۔ میں دیکھ رہا تھا، میں لونڈی کے پاس گیا اور غصے میں اسے زور سے تھپڑ مارا اور کہا بے پرواہ بیٹھی ہوئی ہو، بھیڑیا بکری لے گیا ہے۔ جب زور سے تھپڑ مارا تو پیچھے سے آواز آئی، ابومسعود! اس کو تھپڑ مارنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ تم سے طاقتور بھی کوئی ہے جو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ کہنے والے رسول اللہؐ تھے۔ نیچے والے پر ظلم کرتے ہوئے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ میرے اوپر بھی کوئی ہے۔ ذرا غور کریں کہ انہوں نے تھپڑ کس کو مارا تھا؟ نوکرانی کو اور بے قصور بھی نہیں مارا بلکہ غلطی کرنے پر مارا تھا، پھر

بھی حضورؐ ناراض ہوئے کہ کیوں مارا ہے۔ حضورؐ نے جب ڈانٹا تو ابو مسعودؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنی اس غلطی کے کفارے میں اس لونڈی کو آزاد کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا، اگر تم اس کو آزاد نہ کرتے تو "**للفحتک النار**" آگ تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ اس تھپڑ کا صلہ یہی تھا کہ تم اسے آزاد کردو۔ ایک تھپڑ جو کہ جرم کرنے پر مارا، اس پر یہ وعید فرمائی، ہمارے ہاں ماتحتوں کے ساتھ نہ معلوم کیا کیا ہوتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا طرز عمل

حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا معمول یہ تھا کہ جیسے کپڑے خود پہنتے تھے ویسے ہی نوکروں کو پہناتے تھے۔ ایک دن ایک آدمی نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے کہا آپ نے جو اتنا قیمتی لباس پہنا ہوا ہے ویسا ہی اپنے غلام اور نوکر کو پہنا رکھا ہے، اس کو کوئی ہلکی پھلکی چادر کافی تھی۔ فرمایا، نہیں بھئی! میں نے رسول اللہﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ تمہارے ماتحت ہیں "**اطعموھم مما تطعمون و البسوھم مما تلبسون**" جو خود کھاتے ہو ان کو بھی وہی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو ان کو بھی وہی پہناؤ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر کام نہ ڈالو، جتنا کر سکتے ہیں ان سے اتنا کام لو، اور اگر زیادہ کام اس کے ذمہ لگا دیا ہے اور تمہیں اندازہ ہے کہ یہ اکیلے نہیں کر سکے گا تو "**اعینوھم**" اس کے ساتھ مل کر کام کرو۔

یہ میں نے چند اصول بتائے ہیں جن کا خلاصہ یہ کہ مزدوری انبیاء کا کام ہے، کوئی حقیر پیشہ نہیں ہے، عزت والا پیشہ ہے۔ مزدور کے ساتھ جو کچھ طے ہو اس کو ٹال مٹول کیے بغیر دیا جائے، ان پر ظلم نہ کیا جائے، ان کو کھانے، پینے، پہننے میں شریک کیا جائے، اور اگر کام ان کی صلاحیت سے زیادہ ہو تو ان کے ساتھ مل کر کام کیا جائے، کام میں ان کی معاونت کی جائے۔

سیرۃ النبی ﷺ اور مسافروں کے حقوق

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مسافروں کے حوالے سے آج میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو جناب نبی کریمؐ کے زمانے کے چند مسافروں کے قصے سناؤں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا واقعہ

حضرت ابوذر غفاریؓ بنو غفار قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، بہت بڑے صحابی ہوئے ہیں۔ ان کا قصہ بخاری شریف میں مذکور ہے، وہ خود بیان کرتے ہیں، قصہ سفر کا بھی ہے اور قبول اسلام کا بھی ہے۔ جاہلیت کے زمانے میں انہیں دیگر بہت سے حضرات کی طرح بت پرستی سے نفرت تھی، موحد تھے، اللہ کی عبادت پسند تھی اور اپنے طور پر عبادت کرتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں، مجھے پتہ چلا کہ مکہ مکرمہ میں کوئی صاحب ہیں جو توحید کی تلقین کرتے ہیں، شرک سے روکتے ہیں اور اللہ کی عبادت کا حکم دیتے ہیں۔ مجھے شوق پیدا ہوا کہ ان کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ میں نے چھوٹے بھائی کو بھیجا کہ مکہ جا کر پتہ کرو یہ صاحب کون ہیں، ان کا تعارف کیا ہے اور ان کی دعوت کیا ہے؟ میرا بھائی مکہ گیا، واپس آ کر اس نے بتایا کہ وہ ایک اچھا شریف آدمی ہے، لوگ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں، توحید کی بات کرتا ہے، شرک سے روکتا ہے، اللہ کی عبادت کا حکم کرتا ہے۔ ابوذرؓ کہتے ہیں مجھے تسلی نہیں ہوئی، میں نے خود جانے کا ارادہ کیا، سفر کا سامان باندھا، کھجوریں پانی ساتھ لیا اور چل دیا۔

شعب ابی طالب کا حصار اور حضرت علیؓ کی مہمان نوازی

مکہ مکرمہ پہنچا تو وہاں کی فضا یہ تھی کہ جناب نبی کریمؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر قریش نے ماحول

بہت تنگ کرر کھا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب شعب ابی طالب میں مکہ والوں نے حضورؐ، آپ کے خاندان اور آپ کے ساتھیوں کا بائیکاٹ کرر کھا تھا۔ قریش کے قبائل نے معاہدہ کر کے تین سال سوشل بائیکاٹ کیے رکھا۔ مکہ مکرمہ میں خوف و ہراس کی کیفیت تھی، آپؐ کا نام لینا بھی پریشانی کا سبب بنتا تھا، میں نے کسی سے آپؐ کے گھر کا پتہ پوچھا کہ کہاں ملیں گے تو کوئی تسلی بخش نہیں ملا، جس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ آسانی سے کوئی آپؐ کا پتہ نہیں بتائے گا اور اگر میں نے زیادہ اصرار کیا تو شاید مجھے تنگ بھی کیا جائے۔ کہتے ہیں، میں مسجد حرام میں جا کر بیٹھ گیا۔ سارا دن وہاں بیٹھا رہا، زمزم پیتا رہا۔ کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، شام کو ایک صاحب آئے، پوچھا، مسافر ہو؟ میں نے کہا جی۔ پوچھا، روٹی کھائی ہے؟ کہا، نہیں۔ کہا، چلو میرے ساتھ چل کر روٹی کھا لو۔ میں سارے دن کا بھوکا بیٹھا ہوا تھا اللہ کا شکر ادا کیا کہ کھانے کا انتظام ہوگیا۔ پرانے زمانے میں ایسے ہوتا تھا، خاص طور پر دیہاتوں میں کہ کوئی مسافر مسجد میں نظر آ جائے تو اسے گھر لے جا کر کھانا کھلا دیتے ہیں، سونے کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں میں گیا، کھانا کھایا اور واپس آ کر اسی جگہ زمزم کے پاس بیٹھ گیا۔

دوسرا دن بھی اسی کیفیت میں گزر گیا کہ خوف و ہراس کی کیفیت تھی، کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شام کا وقت ہوا، کل والا آدمی پھر آیا، اس نے پوچھا، مسافر ابھی یہیں ہے، جانا نہیں ہے۔ میں نے کہا، نہیں! آج ادھر ہی ہوں۔ اس نے کہا، چلو کھانا کھا لو۔ میں نے جا کر کھانا کھایا، واپس مسجد میں رات گزاری۔ تیسرا دن بھی اسی کیفیت میں گزر گیا کسی سے پوچھا بھی تو اس نے جواب نہیں دیا، گھور کر جواب دیا، اور مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ مسافر ہوں، کوئی مجھے پکڑ کر لے جائے تو نہ معلوم میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ تیسرے دن شام کو وہ آدمی پھر آیا اور کہا، مسافر ابھی یہیں ہے، جانے کا وقت نہیں آیا؟ میں نے کہا نہیں ابھی میرا کام نہیں ہوا۔ اس نے کہا، چلو چل کر کھانا کھا لو۔ میں نے اس کے گھر جا کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اس نے پوچھا تم تین دن سے ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے ہو، خیر تو ہے، کس کام آئے تھے؟ میں نے کہا وہ کام بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے، اگر بات اپنے تک رکھو اور کسی کو نہ بتاؤ تو تم سے بات کہہ دیتا ہوں۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے بتاؤ۔ میں نے کہا، مجھے پتہ چلا ہے یہاں کوئی صاحب ہیں جو اللہ کی بات کرتے ہیں، شرک اور

بت پرستی کی مخالفت کرتے ہیں، اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں، میرا ذوق بھی یہی ہے، میں ان سے ملنے آیا ہوں لیکن یہاں کی فضا دیکھ کر کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ آپ اگر بتا دیں تو آپ کی مہربانی، اگر نہیں بتانا تو کم از کم میرا پردہ رکھنا، کسی اور کو نہ بتانا۔

یہ شخص کون تھے جو روزانہ شام کو مہمان کو ساتھ لے جا کر کھانا کھلاتے تھے؟ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ حضرت علیؓ اگرچہ فقیر آدمی تھے، مالدار نہیں تھے، محنت مشقت کرتے تھے لیکن ان کے بارے میں آتا ہے کہ زندگی میں کبھی اکیلے کھانا نہیں کھایا۔ سیدہ فاطمہؓ کہتی ہیں حضرت علیؓ کا معمول تھا، انتظار کرتے تھے کہ کوئی مسافر، کوئی مہمان ہو تو مل بیٹھ کر کھانا کھائیں، اور اگر کوئی نہیں آتا تھا تو یہ خود مدینہ کے راستے میں جا کر کھڑے ہو جاتے، کسی مسافر کو بلا لاتے کہ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں، جب میں نے ان سے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے کہا تم نے صحیح آدمی سے بات کی ہے، میں بھی ان کا ساتھی ہوں، ان کا بھائی ہوں، تمہارا کام بن گیا، اب تمہیں کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی جا کر آرام کرو، صبح میں چاشت کے وقت آؤں گا تو تم چپکے سے میرے پیچھے چل پڑنا، میں تم سے بات نہیں کروں گا، میں اس وقت انہی کے پاس جاتا ہوں، تمہیں وہاں لے جاؤں گا، لیکن میرے پیچھے چلتے ہوئے تم نے ظاہر نہیں ہونے دینا کہ تم میرے پیچھے آ رہے ہو، ورنہ پکڑے جاؤ گے۔ مجھے جہاں بھی خطرہ محسوس ہوا تو میں جوتے کا تسمہ صحیح کرنے کے بہانے بیٹھ جاؤں گا، تم آگے چلتے جانا تا کہ کسی کو اندازہ نہ ہو کہ تم میرے پیچھے چل رہے ہو۔ اس سے اندازہ کریں، اس وقت خوف کی کیا کیفیت تھی۔ صبح حضرت علیؓ آئے، میں ان کے ساتھ پیچھے پیچھے چل پڑا، راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

قبولِ اسلام اور قریش کا ردعمل

جناب نبی کریمؐ ان دنوں زید بن ارقمؓ کے مکان پر خفیہ مجلس کیا کرتے تھے، خاص خاص ساتھیوں کو پتہ ہوتا تھا جو چپکے سے وہاں آ جاتے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں، حضورؐ وہاں موجود تھے، میں وہاں پہنچا اور جناب نبی کریمؐ سے ملاقات کی، تعارف کرایا کہ بنو غفار قبیلے کا ہوں، میرا نام ابوذر ہے، آپ کے بارے میں سنا تھا، پہلے بھائی کو بھیجا تھا، اس نے کوئی تسلی بخش بات نہیں بتائی،

اب میں خود آیا ہوں، تین دن سے حرم میں بیٹھا رہا ہوں۔ یہ آدمی روزانہ مجھے ملتا تھا، آج میں نے اس سے بات کی تو یہ مجھے آپ کے پاس لے کر آ گیا۔ اب آپ بتائیں آپ کیا باتیں کرتے ہیں؟ آپؐ نے دین کی بنیادی باتوں کی دعوت پیش کی، اللہ کی دعوت، توحید کی دعوت، قیامت اور رسالت کی بات کی۔ میں نے کہا، آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، مجھے کلمہ پڑھائیے۔ میں نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ پھر پوچھا اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ آیا اپنی مرضی سے تھا لیکن اب تو کلمہ پڑھ لیا ہے، کلمہ پڑھنے کے بعد کیا مسلمان کی اپنی مرضی باقی رہ جاتی ہے؟ آج ہماری مرضی تو شروع ہی کلمہ کے بعد ہوتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ابھی تو تم اپنے قبیلے میں واپس جاؤ، کسی کو بتانا نہیں ورنہ لوگ تنگ کریں گے۔ مجھے اندازہ ہے کہ ہمیں کچھ عرصے تک یہاں سے جانے کی اجازت مل جائے گی تو ہم یہاں سے ہجرت کر کے کسی جگہ اپنا مستقل ٹھکانہ بنائیں گے۔ جب تمہیں یہ پتہ چلے کہ ہم نے مکہ چھوڑ دیا ہے اور کسی جگہ ٹھکانہ بنا لیا ہے تو تم وہاں آ جانا، اس وقت تک تم نے کسی کو بتانا نہیں ہے، گھر جا کر چپکے سے اللہ اللہ کرتے رہو۔

ابوذرؓ کہتے ہیں میں حضورؐ کی باتیں سن کر رات حرم میں آ گیا کہ صبح واپس جاؤں گا۔ صبح ہوئی تو چاشت کے وقت مکہ کے بڑے بڑے لوگ اور چوہدری حرم میں اپنے معمولات کے لیے اکٹھے ہوتے تھے، میرے ضمیر نے مجھے کہا کلمہ پڑھ کر یوں چپکے چپکے چلے جانا ٹھیک نہیں ہے، ان کو پتہ چلنا چاہیے کہ میں نے کلمہ پڑھا ہے۔ مجھے حضورؐ کی بات بھی یاد تھی لیکن میرا ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ تم نے کلمہ پڑھا ہے کوئی گناہ تو نہیں کیا، اس کا اظہار کرو۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ انہیں بتا کر جاؤں گا۔ قریش کا مجمع لگا ہوا تھا، میں بیچ میں جا کر کھڑا ہو گیا اور ان سے کہا، مجھے جانتے ہو میں کون ہوں؟ بنوغفار کا ابوذر ہوں "اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمدًا رسول اللّٰہ"۔ میرا کلمہ پڑھنا تھا کہ گویا وہاں دھماکہ ہو گیا، وہ حیران تھے کہ بنوغفار کا آدمی یہاں آ کر کلمہ پڑھ رہا ہے اور ہمارے درمیان آ کر اظہار بھی کر رہا ہے۔ اب وہ مجھ پر حملہ آور ہوئے، کوئی مکے مار رہا ہے، کوئی جوتے مار رہا ہے، کوئی کپڑے کا کوڑا بنا کر مار رہا ہے، کوئی ڈنڈے مار رہا ہے۔ مجھے لٹا دیا اور مارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ قریب تھا کہ میں مر جاتا، حضرت عباسؓ جو حضورؐ کے چچا محترم تھے، انہوں نے کلمہ فتح مکہ کے موقع پر پڑھا ہے لیکن چچا بھتیجا کی دوستی پہلے سے تھی، انہوں نے دیکھ لیا

کہ یہ تو اسے ماردیں گے، انہوں نے شور مچایا ارے خدا کے بندو! کیا کر رہے ہو؟ آ کر لوگوں کو مجھ سے ہٹایا، مجھے نکالا اور ان سے کہا یہ بنوغفار کا آدمی ہے اور قبیلہ بنوغفار شام کے تجارتی قافلوں کے راستے میں ہے، یہ مر گیا تو تمہارا تجارت کا راستہ بند ہو جائے گا، تمہیں اس کا قبیلہ وہاں سے نہیں گزرنے دے گا، پھر غلہ کہاں سے لاؤ گے، راستہ بند کروانا ہے؟ پھر مجھے کہا، آپ کو کس نے کہا تھا ان کے سامنے کلمہ پڑھو، اب یہاں سے کھسک جاؤ۔ وہ تو کہہ کر چلے گئے۔ میں جا کر زمزم کے پاس بیٹھا، سانس برابر ہوا تو میں نے سوچا ابھی نہیں جاؤں گا، ایک راؤنڈ اور ہونا چاہیے۔

رات ادھر ہی گزاری۔ صبح اسی وقت پھر میں نے ان کے سامنے آ کر کہا، میں ابوذر ہوں، بنوغفار سے آیا ہوں "**اشهد ان لا اله الا اللّٰه و اشهد ان محمدًا رسول اللّٰه**"۔ وہ پھر مجھ پر حملہ آور ہو گئے اور پٹائی شروع کر دی اور میری وہی کل والی حالت ہو گئی۔ عباسؓ دور سے دوڑتے ہوئے آئے اور لوگوں کو مجھ سے ہٹایا، انہیں لعن طعن کیا کہ یہ مسافر ہے اسے کیوں مارتے ہو؟ بڑی مشکل سے مجھے ان سے بچایا، اور مجھے کہا، اللہ کے بندے کل تمہیں اتنی مشکل سے چھڑایا تھا اور کہا تھا کہ کھسک جاؤ، تم نے آج پھر وہی کام کیا، جاؤ چلے جاؤ۔ میں پھر زمزم کے کنویں پر جا کر بیٹھ گیا، سانس برابر ہوا، پانی پیا، آرام کیا، تازہ دم ہوا تو میں نے سوچا رات پھر ادھر ہی رہوں گا اور ایک راؤنڈ اور ہونا چاہیے۔ رات سو گیا، صبح اسی وقت پھر مشرکین کے مجمع میں جا کر میں نے کلمہ پڑھ دیا، وہ پھر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ عباسؓ اس بار بھی تاک میں تھے، تیسری بار بھی انہوں نے مجھے چھڑایا اور کہا یہاں سے جاتے کیوں نہیں ہو، ان کے ہاتھوں مرنا ہے؟ اس طرح تین دن میں نے خود اپنی پلاننگ کے ساتھ مار کھائی اور پھر وہاں سے گیا۔

اس مسافر کا قصہ بڑا ایمان افروز قصہ ہے، میں نے اس قصہ کا خلاصہ بیان کیا ہے، تفصیلی قصہ بخاری شریف میں موجود ہے۔ اسے کہتے ہیں ایمان، اللہ رب العزت اس ایمان کی چھوٹی سی جھلک ہمیں بھی نصیب فرما دے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کا واقعہ

ایک اور مسافر کا قصہ سنانا چاہوں گا، وہ مسافر مدینے کے ہیں، حضرت ابوسعید خدریؓ انصاری

صحابہ میں سے ہیں۔ کہتے ہیں ہم کچھ ساتھی سفر پر جا رہے تھے۔ پرانے زمانے ایسا میں ہوتا تھا، راستے میں رات پڑ جاتی تو مسافر قریب کسی بستی میں جا کر آواز دیتے تھے کہ ہم مسافر ہیں روٹی کھلا دینا۔ اس وقت ہوٹل اور تندور وغیرہ تو ہوتے نہیں تھے، لوگ روٹی کھلا دیا کرتے تھے اور بستر بھی لا دیا کرتے تھے۔ جب سے بستر غائب ہونا شروع ہوئے تو لوگوں نے یہ بند کر دیا، ورنہ یہ ہوتا تھا۔ ابوسعیدؓ کہتے ہیں، ہم نے گاؤں کے باہر خیمہ لگایا اور گاؤں میں آواز دی کہ ہم چند مسافر ہیں، ہمیں کھانا کھلا دینا۔ انہوں نے کہا، کہاں سے آئے ہو؟ ہم نے بتایا مدینہ سے۔ انہوں نے کہا اچھا! محمد کے ساتھی ہو، صابی ہو، جاؤ تمہارے لیے کوئی روٹی نہیں ہے، بیٹھے رہو۔ بستی والوں نے کھانا دینے سے انکار کر دیا۔ ہم آ کر بیٹھ گئے، اپنی تو پکا نہیں سکتے تھے، رات کو لیٹ گئے، بھوک میں نیند بھی کہاں آتی ہے۔ آدھی رات کا وقت ہوا تو گاؤں سے ایک دو آدمی آئے، کہنے لگے کہ ہمارے سردار کو سانپ یا بچھو وغیرہ نے ڈس لیا ہے وہ بیچارہ تڑپ رہا ہے، ہمارا کوئی علاج کامیاب نہیں ہو رہا، آپ میں سے کسی کے پاس کوئی دَم ٹونہ وغیرہ ہو تو مہربانی کرو ہمارے ساتھ چلو، ہمارا سردار مر رہا ہے۔ ابوسعید کہتے ہیں میں نے کہا کہ میرے پاس ٹونہ اور دَم ہے، میں دَم کروں گا وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن ہم مسافر ہیں تم سے کھانا مانگا تم نے ہمیں کھانا نہیں کھلایا، اس لیے ایک سو (ایک روایت کے مطابق تیس) بکریاں لوں گا تب دم کروں گا ویسے دم نہیں کروں گا۔ انہوں نے کہا ہم بکریاں دے دیں گے۔ ابوسعیدؓ نے کہا نہیں! پہلے بکریاں دو پھر دم کروں گا۔ وہ مجبور تھے کیا کرتے، انہوں نے بکریاں لا کر دیں اور کہا اب ساتھ چلو دم کرو۔ حضرت ابوسعیدؓ نے جا کر اسے دم کیا تو وہ آدمی ٹھیک ہو گیا، ایسے جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

اب ان صحابہ نے خیمے میں آ کر صلاح مشورہ کیا کہ بکریاں تو ہم نے غصے میں لے لی ہیں لیکن نہ معلوم یہ لینا درست تھا یا نہیں۔ کسی نے کہا، واپس کر دو۔ دوسرے نے کہا، ان کو تو واپس نہیں کریں گے۔ مدینہ چلتے ہیں، جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں سارا قصہ عرض کرتے ہیں، بکریاں پیش کرتے ہیں اور ان کا حکم معلوم کرتے ہیں، اس وقت تک استعمال نہیں کریں گے جب تک آپؐ اجازت نہ دے دیں۔ چنانچہ مدینہ پہنچے اور جا کر آپؐ کی خدمت میں سارا قصہ سنایا اور بکریاں پیش کیں کہ ان کا کیا حکم ہے، ہمارے لیے جائز ہیں یا نہیں؟ اگر جائز ہیں تو ہم آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور اگر

جائز نہیں ہیں تو بیت المال میں جمع کرا دیتے ہیں۔ آپؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا، ٹھیک ہے یہ بکریاں تمہاری ہیں ان میں میرا حصہ بھی نکالو۔ یہ تسلی دینے کے لیے فرمایا کہ تمہارے لیے یہ جائز ہیں، پریشانی والی بات نہیں ہے۔ آپؐ نے پوچھا، دَم کس نے کیا تھا؟ ابوسعیدؓ نے کہا، میں نے۔ آپؐ نے پوچھا، کیا پڑھا تھا؟ انہوں نے کہا یارسول اللہ! سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تھا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا، تمہیں کس نے بتایا تھا کہ سورہ فاتحہ دم ہے۔ ایک وہ منظر تھا ابوذرؓ کے ایمان کا، اور ایمان کا ایک پہلو یہ ہے کہ ابوسعیدؓ نے کہا یارسول اللہ! ایک دفعہ آپ کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ سورہ فاتحہ کا نام سورہ شفاء بھی ہے، بس ایمان تھا اور آپ کے فرمان پر یقین تھا، میں نے دم کر دیا اور اللہ نے ٹھیک کر دیا۔ یہ میں نے دو مسافروں کے قصے سنائے ہیں۔

اصحابِ صفہ اور حضرت ابو ہریرہؓ کا واقعہ

جناب نبی کریمؐ نے بہت سفر کیے ہیں۔ دس سال میں ستائیس غزوے کیے، ایک سال میں اوسطاً پونے تین سفر بنتے ہیں، گویا آپؐ اکثر سفر میں ہی رہتے تھے۔ حضورؐ نے خود بھی بہت سفر کیے ہیں اور مسافروں کو بھی بہت سنبھالا ہے۔ حضورؐ کے پاس مدینہ منورہ میں ہر وقت مسافروں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اصحاب صفہ مسافر ہی تھے۔ ایک چھتہ سا ڈال رکھا تھا جو حضورؐ کا مہمان خانہ تھا۔ اس میں چالیس سے اَسی تک کی تعداد رہا کرتی تھی۔ یہ حضرات حضورؐ سے ملاقات اور آپؐ کی صحبت میں رہنے کے لیے آتے تھے، کئی کئی دن آپؐ کی خدمت میں رہتے تھے اور انصار مدینہ ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ کوئی دودھ لے آتا، کوئی کھجوریں لے آتا، کوئی انگور لا کر لٹکا دیتا، اور کبھی بھوکا بھی رہنا پڑتا تھا، ان میں سے ایک مسافر کا قصہ سناتا ہوں۔

حضرت ابو ہریرہؓ اپنا قصہ سناتے ہیں کہ میں اصحابِ صفہ میں سے تھا، کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا، پانی اور چند کھجوروں پر گزارہ کرتے۔ کبھی کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ ایک دن ایسے ہی سخت بھوک لگی ہوئی تھی لیکن حضورؐ کا مہمان تھا کسی سے مانگنا بھی نہیں تھا، بھوک سے لڑکھڑا رہا تھا۔ اتنے میں حضرت عمرؓ جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے ان کے پاس جا کر سلام کہا اور ان سے باتیں شروع کر دیں اور پوچھا کہ حضرت! قرآن کریم کی فلاں آیت کا مطلب کیا ہے؟ انہوں نے

آیت کا مطلب رستے میں چلتے چلتے بتایا۔ ان کے دروازے تک پہنچے، حضرت عمرؓ نے گھر پہنچ کر دروازہ بند کرلیا، وہ اندر چلے گئے اور میں باہر رہ گیا۔ کہتے ہیں مجھے آیت کا مطلب معلوم تھا، آیت پوچھنا مقصد نہیں تھا، مقصد یہ تھا کہ میری آواز سن کر سمجھ جائیں گے کہ بھوکا ہے تو کھانا کھلا دیں گے۔ میرا داؤ کامیاب نہیں ہوا، وہاں سے لڑکھڑاتا ہوا واپس ہوا۔

جناب نبی کریمؐ نے دیکھ لیا، فرمایا، ابو ہریرہ! بھوک لگی ہوئی ہے؟ میں نے کہا یارسول اللہ! بھوک سے برا حال ہے۔ آپؐ نے چہرہ سے اندازہ کرلیا تھا کہ بھوک لگی ہوئی ہے۔ آپؐ گھر تشریف لے گئے، اپنے حجروں میں پوچھا کہیں کوئی کھانے کی چیز ہوتو ایک سافر بھوکا ہے۔ چوتھے یا پانچویں حجرے سے دودھ کا پیالہ لے کر آئے تو میری جان میں جان آئی۔ میں خوش ہوا کہ گزارہ ہوجائے گا۔ آپؐ نے فرمایا، ابو ہریرہ! جاؤ صفہ والوں کو بلا لاؤ۔ میں پریشان ہوا کہ یہ بھی گیا۔ ایک پیالہ دودھ کا ہے اور صفہ میں چالیس پچاس آدمی ہیں، مجھے اس میں سے کیا ملے گا۔ لیکن حضورؐ کا حکم تھا، میں گیا اور ان سے کہا، آپ کو حضورؐ بلاتے ہیں، سب آگئے حضورؐ نے فرمایا، گھیرا ڈال کے بیٹھ جاؤ، سب بیٹھ گئے۔ آپؐ نے مجھے پیالہ دیا کہ ان کو پلاؤ۔ میں نے پلانا شروع کیا۔ ایک نے پیا، دوسرے نے پیا، پیالہ ویسے کا ویسا ہی رہا، حتیٰ کہ سب نے باری باری دودھ پی لیا لیکن پیالہ ویسے کا ویسا ہی دودھ سے لبریز رہا۔ پھر مجھے حضورؐ نے فرمایا، تم پیو۔ میں نے پیا۔ آپؐ نے فرمایا، اور پیو۔ میں نے اور پیا۔ پھر فرمایا، اور پیو۔ میں نے اور پیا، اتنا پیا، اتنا پیا کہ اب بھی (یعنی چالیس پچاس سال بعد جب واقعہ بیان کیا) حلق میں دودھ اچھلتا ہوا محسوس ہورہا ہے۔ پھر حضورؐ نے باقی ماندہ خود پیا۔

آج میں نے دورِ نبویؐ کے دو تین مسافروں کے قصے سنائے ہیں۔ مسافر کے حقوق کے بارے میں آپؐ کا اسوۂ یہ ہے کہ اسے صحیح مشورہ دینا صحیح راستہ بتانا، جس کا ٹھکانہ کوئی نہ ہو اسے ٹھکانہ دینا، اور جو بھوکا پیاسا ہو اسے کھلانا پلانا اس کی خدمت کرنا یہ بڑے اجر وثواب کی بات ہے، یہ بھی مہمان کی خدمت کی طرح ہی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں مسافروں کو سنبھالنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

سیرۃ النبی ﷺ اور غیر مسلموں کے حقوق

بعد الحمد و الصلوٰۃ۔ آج کی گفتگو کا عنوان ہے سیرۃ النبیؐ اور غیر مسلموں کے حقوق۔ نبوت سے پہلے تو مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں تھا، البتہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئس سالہ نبوی زندگی، یعنی تیرہ سالہ مکی اور دس سالہ مدنی زندگی میں آپؐ کا تین قسم کے کافروں کا سامنا ہوا اور تینوں کے ساتھ آپؐ کا معاملہ الگ الگ تھا:

(۱) محارب کفار

ایک وہ کافر تھے جو اسلام کے راستے کی رکاوٹ بھی تھے، مخالفت بھی کرتے تھے، آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو تیرہ سال بہت تنگ کیا اور دس سال بدر، احد اور خندق کی جنگوں میں آپؐ کا مقابلہ کیا۔ ان کافروں میں قریش، بنوثقیف، اور بنوہوازن شامل رہے ہیں۔ ان کو فقہاء کی اصطلاح میں ''محارب کافر'' کہا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ آپؐ کا طرزِ عمل مکی زندگی میں برداشت کرنے کا تھا اور مدنی زندگی میں مقابلہ کرنے کا تھا۔ مکی دور میں قرآن کریم کا یہ حکم تھا ''**کفوا ایدیکم**'' (سورہ النساء ۷۷) ہاتھ نہیں اٹھانا، برداشت کرنا ہے۔

حضرت خباب بن ارتؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرا مالک بہت زیادتیاں کرتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا صبر کرو۔ انہوں نے کہا برداشت سے باہر ہے۔ فرمایا صبر کرو۔ انہوں نے اپنی کمر سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ میرا حال دیکھیں، میرا مالک اسلام قبول کرنے کی سزا میں مجھے کوئلے جلا کر اوپر لٹا دیتا ہے اور اوپر بیٹھ جاتا ہے میرے جسم سے خون بہہ کر کوئلے بجھاتا ہے، میرے جسم میں پیپ پڑی ہوئی ہے۔

چنانچہ تیرہ سالہ مکی دور میں محارب کافروں سے آپؐ کا طرزِ عمل صبر، حوصلہ اور برداشت کا رہا۔ مدنی دور میں آٹھ سال مقابلہ ہوا چونکہ یہ حکم مل گیا تھا کہ **"اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللّٰہ علٰی نصرھم لقدیر"** (سورہ الحج ۳۹) تو بدر، احد اور خندق میں مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے کے نتیجے میں مکہ فتح ہو گیا۔ اس سے پہلے ساری عرب دنیا انتظار کر رہی تھی کہ اس مقابلے میں کون غالب آتا ہے، جو بھی غالب آئے گا ہم اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ فتح مکہ میں جب اس مقابلے کا فیصلہ ہو گیا اور بنو ہوازن نے بھی اس کے ساتھ ہی شکست کھائی، بنو ثقیف نے معاہدہ کر لیا۔ چنانچہ ان محارب کافروں کے ساتھ حضورؐ نے صبر کا دور بھی گزارا ہے اور مقابلے کا دور بھی گزارا ہے۔

(۲) غیر محارب کفار

کافروں کی دوسری قسم جو مقابلے پر نہیں تھے ان کے ساتھ آپؐ نے حالات کے مطابق گزارا کیا۔ مثال کے طور پر مدینہ میں آنے کے بعد جب تک یہودی مقابلے پر نہیں آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جنگ نہیں چھیڑی، ان سے معاہدہ تھا کہ ہمارے راستے میں رکاوٹ نہ بنو، اگر رکاوٹ بنو گے تو جنگ ہوگی، ویسے تم اپنی جگہ رہو، ہم اپنی جگہ رہتے ہیں۔ بلکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب آپؐ نے مدینہ میں اسلام کی پہلی ریاست قائم کی تو وہ ریاست یہود کے ساتھ مل کر قائم کی۔ حضورؐ نے جنگ کر کے، مقابلہ کر کے مدینہ کی ریاست نہیں بنائی بلکہ تین سال مذاکرات چلتے رہے ہیں، بیعتِ عقبہ اولیٰ، بیعتِ عقبہ ثانیہ اور میثاق مدینہ۔ تین سال کے مذاکرات کے بعد آپؐ نے یہود، دیگر قبائل اور انصار کے ساتھ مل کر اسلامی ریاست قائم کی۔ یہ ریاست کافروں پر غلبہ پا کر نہیں بلکہ ان کے اشتراک سے قائم ہو گئی تھی۔

یہودیوں نے بعد میں اپنی سازشوں کی مار کھائی ہے جس کی وجہ سے جلاوطن ہوئے اور پھر خیبر کی لڑائی ہوئی۔ ورنہ احزاب تک یہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہی تھے۔ خیبر میں یہودیوں کو شکست ہو گئی، آپؐ نے ان کو جلاوطن کرنے کا ارادہ فرما لیا۔ یہودی آئے اور عرض کیا کہ آپ نے فتح حاصل کر لی ہے، ہمارے علاقے اور زمینوں کے آپ مالک ہو گئے ہیں، اب ہم نے علاقہ

چھوڑنا ہے، لیکن کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ہمیں مزارع کے طور پر قبول فرمالیں۔ اصولاً یہودیوں کو وہ زمین چھوڑ کر جانا تھا کہ مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا، زمینیں مسلمان مجاہدین میں تقسیم بھی ہوگئی تھیں۔ آپؐ نے ان یہود کی پیشکش قبول فرمالی کہ ٹھیک ہے مزارع کے طور پر رہو گے لیکن جب تک ہم چاہیں گے، ہمیشہ کے لیے نہیں۔ مدت کا اختیار ہمارے پاس ہوگا، چنانچہ یہی اختیار حضرت عمرؓ نے استعمال کیا تھا جب انہوں نے اپنے دور میں یہود کو خیبر سے نکالنا چاہا تو یہود نے کہا کہ حضرت محمدؐ نے ہم سے معاہدہ کیا ہوا ہے، ہم مزارع ہیں، اس معاہدہ کو آپ کیسے توڑ سکتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا، معاہدہ ہوا ہے لیکن معاہدے کا ایک جملہ مجھے یاد ہے جو تم نظر انداز کر رہے ہو۔ حضورؐ نے فرمایا تھا جب تک ہم چاہیں گے۔ یہ معاہدہ کب تک رہنا ہے یہ اختیار ہمارا ہوگا۔ یہ جملہ یاد ہے؟ انہوں نے تسلیم کیا کہ ہاں حضورؐ نے یہ جملہ بھی کہا تھا، پھر ان کو جلاوطن کر دیا۔ میں یہ بتا رہا ہوں کہ حضورؐ نے ان کی یہ پیشکش قبول فرمائی اور ان کو مزارع کے طور پر قبول کیا۔

یہودیوں کے ساتھ آپؐ نے معاملات کا آغاز لڑائی سے نہیں مذاکرات سے کیا۔ یہاں سے فقہاء نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ غیر محارب کافروں کے ساتھ معاہدہ کر سکتے ہیں، ان کے ساتھ رہ بھی سکتے ہیں جب تک وہ مقابلے پر نہ آئیں۔ عیسائیوں کے ساتھ بھی آپؐ نے یہی معاملہ کیا۔ نجران کے عیسائی آپؐ کے ساتھ گفتگو کے لیے آئے، آپؐ سے مکالمہ ومناظرہ ہوا، مجادلہ ہوا، مباہلہ کی نوبت بھی آئی، لیکن بالآخر معاہدہ ہوا۔ عیسائی بھی اسلامی ریاست کا حصہ بنے اور آپؐ نے ان کو اسلامی ریاست کے شہری کے طور پر قبول کیا۔ معاہدہ میں شرطیں طے پائیں کہ یہ تم کرو گے اور یہ ہم کریں گے۔ یہ آپؐ کا معاملہ تھا دوسری قسم کے یعنی غیر محارب کفار کے ساتھ۔ ماحول کے مطابق آپؐ نے ان کے ساتھ صلح بھی رکھی، معاہدات بھی کیے، شراکت بھی کی۔

(۳) منافقین

کافروں کی تیسری قسم منافقین مدینہ کی تھی جن کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے ”**ومن الناس من یقول اٰمنّا باللّٰہ وبالیوم الاٰخر وما ھم بمؤمنین**“ (سورہ البقرہ ۸) بعض لوگ ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن وہ مومن نہیں ہیں۔ ”**وما ھم بمؤمنین**“ کا فتویٰ آج کے کسی

دارالافتاء کا نہیں تھا بلکہ مفتی اعظم اللہ تعالیٰ کا فتویٰ تھا۔ کافروں کی اس قسم کے ساتھ مدنی دور کے دس سال واسطہ رہا، ان کے ساتھ آپؐ کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ شرارت تو یہ ہر موقع پر کرتے رہے، کیا کیا شرارتیں انہوں نے نہیں کیں۔ احد کے موقع پر بغاوت کی، (مسجد ضرار بنائی، حضورؐ کو قتل کرنے کے لیے گھات لگائی)، اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ پر تہمت سے بڑی کوئی شرارت ہو سکتی ہے؟ لیکن جناب نبی کریمؐ نے برداشت کیا، عبداللہ بن ابی سامنے بیٹھا تھا۔ حضرت سعد بن معاذ نے کہا یا رسول اللہؐ اجازت ہو تو اس کو قتل کر دوں؟ فرمایا، نہیں۔

چنانچہ آپؐ نے منافقین سے محاذ آرائی نہیں کی، لڑائی نہیں کی۔ محارب کفار کے ساتھ دس سالہ مدنی دور میں حضورؐ کی ستائیس جنگیں ہوئی ہیں جو سال کی اوسطاً تین جنگیں بنتی ہیں، ہر چار مہینے بعد لڑائی، لیکن منافقین کے ساتھ ایک جنگ بھی نہیں لڑی۔ یہ گھر میں بیٹھے ہوئے کافر جن کو "**وما هم بمؤمنين**" فرمایا گیا اور جن کے متعلق حکم ہوا "**يا ايها النبى جاهد الكفار والمنافقين واغلظ عليهم**" (سورہ التوبہ ۷۳) اے نبیؐ! کافروں سے بھی جہاد کرو اور منافقوں سے بھی جہاد کرو، اور ان پر سختی کرو۔

میں یہاں ایک سوال کیا کرتا ہوں کہ کافروں سے تو حضورؐ نے ستائیس جنگیں لڑی ہیں، منافقوں سے کون سی جنگ لڑی ہے؟ کسی ایک منافق کو قتل بھی ہونے دیا ہے؟ حضرت عمرؓ بار بار اجازت مانگتے کہ مجھے اجازت دیں میں اس منافق کی گردن اتار دوں، حضرت خالد بن ولیدؓ نے تلوار نکال کر اجازت مانگی کہ اس منافق کی گردن میں اتارتا ہوں، لیکن آپؐ نے اجازت نہیں دی۔

اس قسم کے کافروں کے ساتھ حضورؐ کا الگ طرز عمل تھا۔ احد کی جنگ میں ایک ہزار میں سے سات سو میدان میں رہے، تین سو منافق غداری کر کے واپس آ گئے تھے۔ گویا احد کی جنگ کے موقع پر منافقین اور مومنین کا تناسب تیس اور ستر فیصد تھا۔ بعد میں مسلمانوں کی اس پر آپس میں بحث ہوئی کہ ان منافقوں کے ساتھ لڑنا چاہیے یا نہیں۔ بعض کا کہنا تھا کہ نہیں لڑنا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا "**فما لكم فى المنافقين فئتين والله اركسهم بما كسبوا**" (سورہ النساء ۸۸) تمہیں ان سے لڑنے کی کیا ضرورت ہے، تم چھوڑو میں خود سنبھال لوں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کلمہ گو کافروں کے ساتھ معاملہ الگ ہوتا ہے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ جناب نبی کریمؐ نے ان منافقین سے بھی جنگ لڑی ہے لیکن تلوار کی نہیں بلکہ حکمت عملی کی جنگ لڑی ہے۔ حکمت عملی کے ساتھ ان کو بے اثر کر دیا۔ حضورؐ نے ان سے جنگ نہ لڑنے کی وجہ بھی خود بیان فرمائی ہے۔ بخاری کی روایت ہے، حضرت عمرؓ نے کسی موقع پر منافق کی گردن اڑانے کی اجازت چاہی تو حضورؐ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ لوگ یہ کہیں گے کہ محمد نے تو اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا ہے، یہ بات اسلام کی دعوت میں رکاوٹ بنے گی۔ لوگ تو انہیں مسلمان سمجھتے ہیں کہ یہ کلمہ پڑھتے ہیں اور ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔

حضورؐ نے دس سال میں کسی ایک منافق کو قتل نہیں ہونے دیا لیکن انہیں مورچہ بھی نہیں بنانے دیا، اپنے خلاف محاذ نہیں بنانے دیا۔ منافقین نے مسجد ضرار کی شکل میں خفیہ مورچہ بنانا چاہا جو آپؐ نے نہیں بنانے دیا۔ ”والذین اتخذوا مسجدًا ضرارًا و کفرًا و تفریقًا بین المؤمنین و ارصادًا لمن حارب اللّٰہ و رسولہ من قبل“ (سورہ التوبہ ۱۰۷)۔ آپؐ نے محاذ اور مورچہ بھی منافقین کو نہیں بنانے دیا، محاذ آرائی اور لڑائی بھی نہیں کی، قتل بھی نہیں کرنے دیا۔ تین سو آدمیوں کی میدان جنگ سے غداری برداشت کی، حضرت عائشہؓ پر تہمت جیسی بات بھی برداشت کی، اجتماعی کوئی ایکشن نہیں لیا، مسجد ضرار نہیں بنانے دی بلکہ گرا دی لیکن بنانے والوں کے خلاف ایکشن نہیں لیا، البتہ اپنے ساتھ اعتماد میں بھی نہیں لیا اور ان کو کوئی حیثیت اختیار نہیں کرنے دی۔ یہ بڑی خوفناک سزا ہوتی ہے کہ مقابلے پر بھی نہیں آنے دینا اور ساتھ بھی نہیں ملانا۔ جس کو شاعر نے کہا ؎

ہم تو دشمن کو بھی کچھ ایسی سزا دیتے ہیں
ہاتھ اٹھاتے نہیں، نظروں سے گرا دیتے ہیں

منافقین کے ساتھ حضورؐ کی دس سالہ حکمت عملی کا خلاصہ یہی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ احد میں ہزار میں سے تین سو تھے یعنی تیس فیصد۔ لیکن جب حضورؐ دنیا سے رخصت ہوئے تو صرف تیرہ چودہ منافق تھے۔ تبوک سے واپسی پر انہوں نے حضورؐ کا راستہ روکا تھا جو چہرے لپیٹے ہوئے تھے، حضورؐ کو شہید کرنا چاہتے تھے، ناکام ہو گئے۔ اس وقت حضورؐ کے ساتھ صرف حضرت حذیفہؓ تھے ان کو حضورؐ نے ان سب کے نام بتائے، اس شرط پر کہ ان کے نام کسی اور کو نہیں بتانے۔ تو اس وقت بظاہر یہ چودہ منافق رہ گئے تھے جن کا علم صرف حضرت حذیفہؓ کو تھا اور کسی کو ان کا پتہ بھی نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ

نے حذیفہؓ پر بہت زور لگایا کہ مجھے ان کے نام بتائیں۔کوئی علامت،نشانی،کوئی اشارہ ہی دے دیں۔حضرت حذیفہؓ نے کہا، رسول اللہ سے وعدہ کیا ہوا ہے، آپ کو کیسے بتا سکتا ہوں۔حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کا معمول بن گیا تھا کہ کسی عام آدمی کا جنازہ ہوتا تو جنازہ گاہ میں جاتے، وہاں دیکھتے کہ حضرت حذیفہؓ جنازے میں ہیں یا نہیں، اگر وہ موجود ہوتے تو تسلی سے جنازہ پڑھاتے، ورنہ واپس آجاتے اور جنازہ نہ پڑھاتے، بلکہ کہتے خود ہی پڑھ لواس لیے کہ مبادا یہ ان چودہ منافقین میں سے نہ ہو۔

یہ تھی آپؐ کی حکمت عملی جس کی بنا پر منافقین کو سوسائٹی میں غیر مؤثر کر کے دھیرے دھیرے سے ایسے غائب کیا کہ نظر بھی نہیں آئے کہ کدھر گئے، اس کو کہتے ہیں ڈپلومیسی اور حکمت عملی کی جنگ۔ جناب نبی کریمؐ کو ان تین قسم کے کافروں سے واسطہ رہا۔

(۱) محارب کافروں سے حضورؐ نے مقابلہ کیا اور آخر تک شکست دی۔

(۲) غیر محارب کافروں سے آپؐ نے معاہدے بھی کیے، صلح بھی کی، اکٹھے بھی رہے۔

(۳) جبکہ کلمہ گو کافروں کو نہ محاذ آرائی کرنے دی اور نہ ان کو اپنی صفوں میں جگہ دی، ان کو حکمت عملی کے ساتھ ناکام بنایا۔ چنانچہ خلفاء راشدین کے پورے زمانے میں کسی ایک آدمی کا سراغ بھی نہیں ملتا جسے منافقین میں شمار کیا جائے۔اس دور میں منافقین کا کوئی واقعہ منقول نہیں ہے۔آپؐ نے منافقین کو کیسے صاف کیا، اس طرح کہ وہ سارے مسلمان ہو گئے، حضورؐ کے طرز عمل کے باعث اسلام لے آئے۔حضورؐ نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ وہ سب معاشرے میں تحلیل ہو گئے اور ان کا وجود ختم ہو گیا۔

آج میں نے یہ بیان کیا کہ حضورؐ کو تیئیس سالہ دورِ نبوی میں تین قسم کے کافروں کا سامنا کرنا پڑا اور تینوں قسموں کے ساتھ حضورؐ کا معاملہ الگ الگ تھا۔

سیرۃ النبی ﷺ اور افسروں کے حقوق

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ اس سال کی ہماری نشستوں کا موضوع یہ چلا آرہا ہے کہ مختلف طبقات کے ساتھ (مسافروں، قیدیوں، غلاموں، مہمانوں، مزدوروں کے ساتھ) حضورؐ کی سنت مبارکہ کیا تھی؟ آج کی نشست کا عنوان ہے کہ افسروں کے ساتھ حضورؐ کا طرز عمل کیا تھا۔ جناب نبی کریمؐ جن لوگوں کو ڈیوٹی پر مقرر فرماتے، وقتی طور پر یا مستقل طور پر، اس زمانے میں عامل اور والی کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ آپؐ مالیات پر، انتظامی امور میں، ڈیوٹیز پر مختلف عامل مقرر فرماتے تھے، تو ان کی ضروریات کا خیال کرتے تھے، ان کی نگرانی اور احتساب بھی کرتے تھے، اور اگر ان پر غلط الزام لگایا جاتا تو ان کا دفاع بھی کرتے تھے۔ یہ تین دائرے تھے عاملین کے ساتھ حضورؐ کے معاملات کے۔ ان تینوں پر ایک ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

(۱) عاملین کا حق الخدمت

پہلا یہ کہ آپؐ عاملین کی ضروریات کا خیال کرتے، ان کا حق الخدمت ادا کرتے اور یہ تلقین فرماتے تھے کہ جو بھی حق الخدمت بنتا ہو، لینا چاہیے۔

حضرت عمرؓ کی روایت

اس پر حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے، بخاری شریف کی روایت کے مطابق وہ خود کہتے ہیں کہ مجھے جناب نبی کریمؐ نے ایک ڈیوٹی پر مقرر کیا کہ جاؤ یہ کام کر کے آؤ۔ میں کام پورا کر کے آیا تو حضورؐ نے مجھے اس کا وظیفہ، حق الخدمت دیا کہ تم نے ڈیوٹی کی ہے یہ تمہارا حق بنتا ہے، وصول کرو۔ میں نے کہا

مجھے ضرورت نہیں ہے۔ پھر فرمایا، وصول کرو۔ میں نے کہا مجھ سے زیادہ ضرورت منداور لوگ بھی ہیں، کسی اور کو دے دیں۔ حضورؐ نے فرمایا لے لو۔ میں نے پھر کہا، مجھے اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دیا ہوا ہے، میں للہ خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا،نہیں! یہ تمہارا حق بنتا ہے "خذہ فتمولہ" اسے وصول کر کے اپنے مال میں شامل کرلو اس کے بعد اگر چاہو تو صدقہ کر دینا۔ حضرت عمرؓ کا بھی یہی معمول تھا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک عامل نے حضرت عمرؓ کے سامنے تنخواہ لینے سے انکار کیا تو آپؓ نے اسے کہا کہ تنخواہ وصول کرو، اور اپنا مذکورہ واقعہ اسے سنایا۔

اس کی بہت سی حکمتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جب آدمی تنخواہ لے گا تو کام ذمہ داری سے کرے گا، اور اگر مفت میں کرے گا تو ویسی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ دوسرے یہ کہ تنخواہ نہ لینے سے دوسروں میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ یہ تو بغیر تنخواہ کے کام کر رہا ہے اور ہم تنخواہ لے رہے ہیں، اس لیے بھی بلا معاوضہ کام کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے آپؐ نے بلا تنخواہ ڈیوٹی لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کام کے بعد جو بھی تمہارا حق بنتا ہے، وصول کرو۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ کا سوال

عقبہ بن عامرؓ حضورؐ کے عمّال میں سے تھے، انہوں نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! آپ ہمیں کسی علاقے میں ڈیوٹی پر بھیجتے ہیں، ہم جاتے ہیں، ہم وہاں مہمان ہوتے ہیں، ہمارا کھانا پینا اور رہنا ان کے ذمے ہوتا ہے، لیکن اگر اس علاقے والے ہماری ضروریات کا خیال نہ کریں تو ہم کیا کریں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا، اگر تو وہ تمہاری ضروریات کھانا، رہائش وغیرہ کا انتظام کر دیں تو ٹھیک، ورنہ جو تمہارا مہمانداری کا حق بنتا ہے، تو جو تم وصول کر کے لاؤ گے اس میں سے (سرکاری خزانے میں سے) اتنا حق بالمعروف (اپنے اسٹیٹس کے مطابق) وصول کر سکتے ہو۔ اس کو آج کی اصطلاح میں ٹی اے ڈی اے (TA&DA) کہا جاتا ہے یعنی آنے جانے کا خرچہ۔ ہمارے ہاں تو عام طور پر اس میں بہت گڑ بڑ ہوتی ہے کہ ٹی اے ڈی اے بھی لے لیتے ہیں، وہاں کسی کا مہمان بھی بن جاتے ہیں، وہاں سے بھی کھاتے ہیں اور یہاں سے بھی لیتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ سرکاری طور پر پی سی ہوٹل منظور کروا کے اس کے مطابق خرچہ لے لیا اور وہاں جا کر عام

ہوٹل میں رہے، اس طرح جو بچت ہوئی وہ اپنی جیب میں ڈال لی، یہ درست نہیں ہے۔

حضورؐ نے اس کا اصول یہ طے کیا ہے کہ اگر تمہاری حیثیت کے مطابق وہ ضروریات پوری کر دیں تو پھر تم ہم سے وصول نہیں کرو گے، اگر انہوں نے انتظام نہیں کیا تو پھر تم سرکاری رقم میں سے وصول کر سکتے ہو اور وہ بھی بالمعروف، معروف طریقہ سے، جس کا معنٰی فقہاء یہ کرتے ہیں کہ جو تمہارا عام رہن سہن کا معیار ہے اس کے مطابق لے سکتے ہو۔ یہ تو آپؐ نے ملازم، افسر، عامل کا حق قرار دیا کہ حق الخدمت بھی لے اور اگر ضروری خرچہ وہاں سے نہ ملے تو وہ بھی وصول کرے۔

(۲) عاملین کا احتساب

دوسرے یہ کہ حضور نگرانی اور احتساب کیا کرتے تھے کہ عامل وہاں سے کیا لے کر آیا ہے، اگر اسے ناجائز سمجھتے تو ضبط بھی کر لیا کرتے تھے۔ جو لوگ مالیات کے محکمے میں ہوتے تھے، قرآن نے انہیں عاملین فرمایا ہے یعنی صدقہ وصول کرنے والے۔ آج کل مالیات وصول کرنے والے دو محکموں میں تقسیم ہیں (۱) شہروں میں صنعت کاروں اور تاجروں سے ٹیکس وصول کرنے والا انکم ٹیکس آفیسر، (۲) اور دیہاتیوں سے مالیات وصول کرنے والا تحصیلدار۔ اس زمانے میں ان کو عاملین کہا جاتا تھا۔

سرکاری دوروں پر موصول ہونے والے تحائف

بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریمؐ نے ایک صاحب ابن اللتبیہؓ کو خیبر سے سالانہ جزیہ، زکوٰۃ، عشر وغیرہ لینے کے لیے بھیجا۔ خیبر بڑا زرخیز اور سرسبز علاقہ تھا۔ وہ وہاں گئے، وصولی کر کے لائے اور سامان پیش کیا۔ سامان میں کھجوریں، گندم، جو وغیرہ ہوتے تھے، نقدی کی شکل میں بہت کم ہوتا تھا، یہ عام طور پر غلہ کی صورت میں ہوتا تھا۔ انہوں نے سامان لا کر اس کی ڈھیری لگا دی کہ یہ بیت المال کے لیے وصول کر کے لایا ہوں اور ایک ڈھیری الگ رکھ دی۔ آپؐ نے پوچھا، یہ کیا؟ انہوں نے کہا، یارسول اللہ! یہ انہوں نے مجھے ہدیے دیے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، "**ھلا جلست فی بیت امک**" اپنی ماں کے گھر بیٹھے ہوئے تمہیں یہ تحفے ملتے ہیں؟ یہ تمہارا گفٹ نہیں ہے بلکہ تمہاری ڈیوٹی کی وجہ سے لوگوں نے دیا ہے، یہ تمہارا نہیں، بیت المال کا ہے۔ حضورؐ

نے وہ مال ضبط فرما کر بیت المال میں جمع کرا دیا اور مسجد میں جا کر خطبہ ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا کہ ہماری ڈیوٹی پر جاتے ہیں اور تحفے اپنے لیے رکھ لیتے ہیں۔

اس طرح حضورؐ نے ایک اصول طے فرما دیا کہ ڈیوٹی کی وجہ سے کہ یہ افسر ہے، جو گفٹ ملیں گے تو وہ اس کے ذاتی نہیں ہیں، وہ بیت المال اور سرکاری خزانے کے ہیں۔ ہاں اگر کسی کا ذاتی دوست کچھ دے تو وہ الگ بات ہے۔ اس پر آج کی دنیا کا اصول اور عالمی قانون بھی موجود ہے، اگرچہ داخلی ماحول میں اس اصول کی پاسداری نہیں ہوتی اور سب کچھ ہڑپ ہو جاتا ہے، ضابطہ یہ ہے کہ ایک ملک کا سربراہ کسی دوسرے ملک میں جائے تو اسے وہاں سے جو گفٹ ملتے ہیں وہ اس کی ملکیت نہیں ہوتے، ملک کا حق ہوتے ہیں، وہ کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں، واپس آ کر جمع کروانے پڑتے ہیں اور رپورٹ دینا پڑتی ہے کہ مجھے یہ یہ گفٹ ملا ہے۔ اسی طرح جو گفٹ وہ لے کر جاتا ہے وہ بھی سرکاری خزانے سے لے کر جاتا ہے۔ حضورؐ ہدیہ دیتے بھی تھے، لیتے بھی تھے اور آپؐ نے یہ تلقین فرمائی ہے کہ باہر سے آنے والا وفد کچھ لے کر آئے تو صرف وصولی نہ کرو، ان کو کچھ دو بھی، بلکہ کوشش کرو کہ بہتر ہدیہ دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو ڈیوٹی کی وجہ سے جو تحفہ ملے وہ سرکاری ہے اس کا ذاتی نہیں ہے۔

سرکاری فرائض کے دوران ذاتی کاروبار

حضرت عمرؓ بھی اپنے عاملین کا سخت احتساب کرتے تھے۔ ایک گورنر کو بحرین بھیجا، سال دو سال بعد گورنر صاحب واپس آئے تو بہت سا سامان بھی ساتھ لائے۔ ان سے پوچھا کہ جب تم گئے تھے خالی ہاتھ تھے اور اب آئے ہو اتنا سارا مال بھی ساتھ لائے ہو، یہ تمہارے پاس کدھر سے آیا؟ انہوں نے جواب دیا میں وہاں تجارت کرتا رہا ہوں۔ ڈیوٹی بھی کرتا تھا اور تجارت بھی کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، عامل کو ڈیوٹی کے ساتھ تجارت کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ جتنا جاتے وقت اس کے پاس تھا اس کو دیا اور باقی سب لے کر بیت المال میں جمع کر دیا۔

(٣) عاملین کا دفاع

تیسرے یہ کہ اگر آپؐ کے عاملین میں سے کسی پر غلط الزام لگتا تو آپؐ اس کا دفاع کرتے

تھے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کا دفاع

حضرت خالد بن ولیدؓ بڑے جرنیل تھے۔ایک دفعہ مدینہ منورہ میں آپؐ نے کسی کی ڈیوٹی لگائی کہ سب سے زکوٰۃ وصول کرو، زکوٰۃ وصول کی گئی اور پورٹ پیش کی گئی کہ دو آدمیوں نے زکوٰۃ نہیں دی۔ایک حضرت عباسؓ اور دوسرے خالد بن ولیدؓ نے۔حضورؐ نے فرمایا، حضرت عباسؓ کی زکوٰۃ تو میں دے دوں گا، جتنی بنتی ہے مجھ سے لے لو۔"**انتم تظلمون خالدًا**" لیکن خالد پر تم ظلم کر رہے ہو، اس کے پاس کیا ہے کہ تم اس سے زکوٰۃ لینا چاہتے ہو؟ لوگوں نے کہا، یارسول اللہ! اس کے پاس تو بہت سرمایہ ہے، اتنے اتنے قیمتی ہتھیار رکھے ہوئے ہیں۔حضرت خالدؓ بہت قیمتی ہتھیار رکھا کرتے تھے۔آپؐ نے فرمایا، اس نے ہتھیار اور زرہیں جہاد کے لیے رکھی ہوئی ہیں، بیچنے کے لیے تو نہیں رکھی ہوئیں۔تو اس طرح اگر آپؐ کے افسر کے خلاف کوئی ناجائز بات ہو رہی ہوتی تو حضورؐ اپنے افسر کا دفاع بھی کرتے تھے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ کا دفاع

اسی طرح جناب نبی کریمؐ نے اپنی زندگی میں جہاد کے لیے آخری لشکر اسامہ بن زیدؓ کی سربراہی میں تیار کیا۔موتہ کی جنگ میں حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت جعفر طیارؓ شہید ہوئے تھے، اس کا بدلہ لینے کے لیے آپؐ نے لشکر تیار کیا اور عرب روایات کے مطابق حضرت زیدؓ کے بیٹے اسامہ بن زیدؓ کو کمانڈر بنایا، جو ابھی بیس اکیس سال کے نوجوان تھے۔ یہ بات لوگوں کو محسوس ہوئی کہ بڑے بڑے صحابہ لشکر میں ہیں اور اسامہ کو امیر بنا دیا۔لوگوں کے اس اشکال پر آپؐ نے فرمایا "**انکم تطعنون فی امارۃ اسامۃ**" اسامہ کی امارت پر تم اعتراض کر رہے ہو، میں نے جب اس کے باپ کو امیر بنایا تھا اس وقت بھی کچھ لوگوں نے ناک چڑھائے تھے کہ ایک آزاد کردہ غلام کو بڑے بڑے صحابہ پر امیر بنا دیا ہے "**واللہ انہ لخلیق بالامارۃ**" اللہ کی قسم وہ بھی امارت کا اہل تھا اور یہ بھی امارت کا اہل ہے، یہی امیر رہے گا، تمہارا اعتراض غلط ہے۔

آج میں نے افسروں اور عاملوں کے متعلق تین دائرے بیان کیے کہ حضورؐ ان کے حقوق کا

خیال کرتے تھے کہ ان کو تنخواہ، حق الخدمت ملنا چاہیے۔ ان کا احتساب کرتے تھے اگر وہ کوئی زائد چیز لاتے تو اسے ضبط کرلیا کرتے، اس کے ساتھ اگر کسی نے ان کے بارے میں زیادتی کی بات کی ہے تو آپؐ اس کا دفاع بھی کرتے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا دفاع

حضرت عمرؓ کا اپنے افسروں کے دفاع کے متعلق ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جو بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کوفہ کے گورنر تھے۔ کوفہ والوں نے ان پر کوئی اعتراض کردیا اور شکایت مدینہ بھیج دی۔

حضرت عمرؓ نے انکوائری کمیشن بنایا، محمد بن مسلمہؓ کو بھیجا کہ ہمارے گورنر پر اعتراضات ہیں، شکایات ہیں، تم جا کر تحقیق کرو۔ انہوں نے تحقیقات کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کوفے کی ساری مسجدوں میں گورنر صاحب کو ساتھ لے کر باری باری نماز پڑھتے۔ کوفہ میں اس وقت چوالیس، پینتالیس مسجدیں تھیں۔ نماز کے بعد کھڑے ہو کر کہتے کہ میں محمد بن مسلمہ مدینہ سے آیا ہوں، حضرت عمرؓ کا نمائندہ ہوں، ان کے پاس آپ کے گورنر صاحب کی شکایات گئی ہیں، آپ میں سے جس کو کوئی اعتراض ہو تو اب بیان کرے۔ کوئی بھی اعتراض نہ کرتا بلکہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی تعریف کرتا۔

آخری دن ایک مسجد سے ایک صاحب کھڑے ہو گئے، کہا کہ ہمیں ان پر اعتراض ہے کہ یہ ہمیں بیت المال سے حق پورا نہیں دیتے اور نماز میں قرآن مجید صحیح نہیں پڑھتے۔ ایک اعتراض اور بھی کیا۔ سعد بن ابی وقاصؓ مستجاب الدعوات بزرگ تھے، کھڑے ہو کر کہا کہ میں تیری کسی بات کا جواب نہیں دیتا اور اس کو بددعا دی۔ کہا، یا اللہ! اگر یہ جھوٹ بول رہا ہے تو **"اطل عمرہ و اطل فقرہ"** یا اللہ اس کو لمبی عمر دے اور لمبی محتاجی دے، ساری زندگی کی محتاجی دے اور اس کو عورتوں کے فتنے میں مبتلا کر۔ اس کے بعد حضرت سعدؓ نے گورنری سے معذرت کر لی، حضرت عمرؓ نے ان کی معذرت قبول فرمالی۔ اللہ کی قدرت، اس حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ میں نے خود اس بوڑھے کو دیکھا، سو سال سے زیادہ عمر تھی، کانپتا لڑکھڑاتا ہوا کوفے کے بازار میں گھومتا تھا، پلکیں جھک گئی

تھیں، مانگتا پھرتا تھا اور راہ جاتی لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا اور کہتا تھا "**انا دعوة سعد**" میں سعد کی بد دعا ہوں۔

جب حضرت عمرؓ نے اپنی جگہ چھ آدمی مقرر کیے کہ یہ آپس میں کسی کو خلیفہ بنا لیں تو ان میں سعدؓ بھی تھے۔ چونکہ حضرت سعدؓ پر گورنری کے زمانے کا اعتراض تھا تو حضرت عمرؓ نے اس کی صفائی دی، کہا کہ میں نے سعدؓ کا نام لکھوایا ہے، ان کو میں نے گورنری سے کسی غلطی یا اعتراض کی وجہ سے نہیں ہٹایا تھا بلکہ ان کی عزت کے تحفظ کے لیے ہٹایا تھا کہ معزز آدمی ہیں، غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ یہ تیسرا دائرہ ہے کہ عامل اور افسر کی صفائی بیان کرنا اور اس کا دفاع کرنا، یہ بھی افسر کا حق ہے۔

سیرۃ النبی ﷺ اور مہمانوں کے حقوق

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ ابھی ایک عزیز نظم پڑھ رہا تھا ’’کعبے پہ پڑی جب پہلی نظر، کیا چیز ہے دنیا بھول گیا‘‘۔ یہ امر واقعہ ہے کہ وہاں سب کچھ بھول جاتا ہے، ویسے یہ فضیلت بیان کی جاتی ہے کہ کعبے پر جب پہلی نظر پڑے اس وقت جو دعا کی جائے قبول ہوتی ہے، لیکن واقفین حال کہتے ہیں کہ اگر اس وقت ہوش وحواس قائم رہیں تب، ورنہ عام طور پر یاد نہیں رہتا۔

عمرہ کا پہلا سفر

میں اس پر اپنا ذاتی واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی دفعہ ۱۹۸۴ء میں عمرہ کے لیے گیا تو حضرت والد گرامی حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں عمرہ کے لیے جا رہا ہوں، دعا فرما دیں۔ انہوں نے دعا فرمائی اور دعا کرتے ہوئے مجھے نصیحت کی کہ طواف کرتے ہوئے پہلے تین چکروں میں رمل کرنا ہوتا ہے، تو رمل بھول جائے گا۔ میں نے کہا انشاء اللہ نہیں بھولوں گا۔ فرمایا، تو بھول جائے گا، وہاں کوئی نہیں ہوش رہتا۔ میں نے کہا انشاء اللہ نہیں بھولتا۔ فرمایا، بھول جاؤ گے۔ اس پر حضرت ملا علی قاریؒ کا واقعہ سنایا کہ مناسکِ حج پر احناف میں سب سے مفصل کتاب ملا علی قاریؒ کی ہے۔ فرمایا ملا علی قاریؒ نے مناسک الحج لکھی، لوگوں میں عام ہوئی، پھر کسی موقع پر خود حج کے لیے گئے۔ طواف کر رہے تھے کہ کوئی آدمی قریب آیا اور پوچھنے لگا آپ مولوی لگتے ہیں کیا آپ نے ملا علی قاریؒ کی کتاب نہیں پڑھی؟ فرمایا اس میں کیا لکھا ہوا ہے؟ اس نے کہا اس میں لکھا ہوا ہے کہ طواف میں تین چکروں میں رمل کرنا، ہے آپ رمل تو نہیں کر رہے۔ یہ ملا علی قاریؒ خود تھے جنہوں نے لکھا تھا۔ اسی طرح والد صاحب کے سامنے تو میں نے کہہ دیا کہ انشاء

اللہ نہیں بھولوں گا، لیکن والد صاحب کی بات مجھے چوتھے چکر میں یاد آئی کہ میں نے تو رمل بھی کرنا تھا، کیونکہ تینوں چکر میں نے رمل کے بغیر کر لیے تھے۔

نبی کریمؐ اور مہمان نوازی

آج کا ہمارا موضوع ہے کہ مہمان نوازی کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہدایات فرمائی ہیں اور حضورؐ کی سنت مبارکہ کیا تھی؟ آپؐ کا نبوت کے بعد جو پہلا تعارف ہے وہ مہمان نوازی کے حوالے سے ہے۔ جناب نبی اکرمؐ پر جب غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ نے یہ واقعہ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ذکر کیا اور فرمایا "**خشیت علیٰ نفسی**" مجھے اپنے بارے میں ڈر لگنے لگا ہے۔ آپؐ کو تشویش تھی، حضورؐ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ کو تسلی دی کہ "**لن یخزیک اللہ ابدًا**" اللہ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ اور پھر انہوں نے آپؐ کی کچھ صفات بیان کیں کہ ان صفات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ کو پریشان نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ اچھے لوگوں کو پریشان نہیں کیا کرتا۔ ان صفات میں یہ فرمایا "**تصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق**" حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی سماجی خدمات کا ذکر کیا کہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، مصیبت زدہ لوگوں کے کام آتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا سہارا بنتے ہیں، مہمانوں کی مہمانی کرتے ہیں۔

"**الضیف**" اس زمانے میں دو قسم کے لوگوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ ایک وہ جو کہیں سے ملنے کے لیے آئیں اور دوسرے بے ٹھکانہ مسافر پر بھی "**الضیف**" کا لفظ بولا جاتا تھا۔ پہلے زمانے میں ہوتا تھا کہ مسجد میں مسافر آجاتے اور کہتے میں مسافر ہوں تو لوگ ان کی مہمانی کر دیا کرتے تھے۔

حضرت علیؓ کی مہمان نوازی

حضرت علیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک کہ مہمان ساتھ نہ ہوتا۔ اگر کوئی مہمان نہ آتا تو باہر گلی سے کسی مسافر کو گھر لے آتے کہ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ حالانکہ حضرت علیؓ امیر آدمی نہیں تھے، تنگ دستی کے ساتھ گزارا کیا کرتے تھے۔

مہمان کی خدمت و اکرام کے متعلق آنحضرتؐ نے یوں بیان فرمایا "**من کان یؤمن باللہ**

والیوم الاخر فلیکرم ضیفه" جس کا اللہ اور آخرت پر ایمان ہے اسے چاہیے کہ وہ مہمان کا اکرام کرے۔

مہمان کا اکرام

مہمان کا اکرام کیا ہے؟ مہمان کے اکرام میں آنحضرتؐ نے مختلف احادیث میں چار درجے بیان فرمائے ہیں۔ پہلی بات فرمائی، ابوداؤد شریف کی روایت ہے "**لیلة الضیف حق واجب علٰی کل مسلم**" مہمان کی پہلی رات ہر مسلمان پر حق اور واجب ہے۔ کھانے کا ذکر نہیں فرمایا، رات کا ذکر فرمایا، اس سے مراد یہ ہے کہ مہمان کے رہنے، آرام اور کھانے کا انتظام کرنا۔ اس سے اگلا درجہ آپؐ نے فرمایا "**جائزة الضیف یوم و لیلة**" مہمان کا اکرام یعنی اس کے لیے خصوصی طور پر کچھ پکانا، اہتمام کرنا ایک دن اور ایک رات ہے۔ مہمان کا اکرام یہ ہے کہ عام معمول سے ہٹ کر اسے کوئی چیز تیار کی جائے، اس کے لیے منگوائی جائے۔ اور تین دن مہمانی مہمان کا حق ہے، ایک دن خصوصی اور باقی دو دن عمومی جو گھر میں پکا ہو۔ اور چوتھے دن جو اس پر خرچ ہو وہ صدقہ ہے۔ اس سے آپؐ نے مہمان کو بھی اشارہ کیا کہ تمہارا بھی زیادہ دن رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا معمول یہ تھا کہ کہیں جاتے، نافعؒ یا سالمؒ ساتھ ہوتے تھے کہ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ نافع شاگرد اور سالم بیٹے تھے، چوتھے دن ان سے کہتے بیٹا! اب ہم اپنا خرچہ خود کریں گے، چوتھا دن صدقہ ہوتا ہے اور میں صدقہ نہیں کھایا کرتا۔

میزبان کا لحاظ

یہ تو اشارتاً فرمایا، دوسری حدیث میں صراحتاً فرمایا، مہمان کو چاہیے کہ وہ میزبان کو تنگ نہ کر دے کہ وہ دن گننے لگے کہ یہ کب جائیں گے؟ زیادہ سے زیادہ تین دن مہمانی کے ہیں اس کے بعد میزبان کی مرضی ہے، یہ نہیں فرمایا کہ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دو۔

میزبان کو تنگ کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً کہیں مہمان ہوا تو خواہ مخواہ کیڑے نہ نکالے کہ یہ جگہ کیسی ہے، کھانے میں نمک زیادہ تھا، سالن میں مرچیں زیادہ تھیں، چائے کیسی بنائی ہے، وغیرہ۔ انہوں نے اپنی حیثیت کے مطابق جیسا انتظام کیا ہو، شکر کے ساتھ قبول کرے۔ ظاہر ہے

مزاج مختلف ہوتے ہیں تو کیا یہ ضروری ہے کہ میں جہاں جاؤں وہاں ساری باتیں میری مرضی کے مطابق ہوں؟ کئی باتیں میرے معیار سے زیادہ ہوں گی، کئی کم ہوں گی، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ میں جہاں جاؤں وہاں سارے کام میری مرضی کے مطابق ہوں۔ اس لیے خواہ مخواہ نکتہ چینی کرنا اور عیب نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ میزبان کی حیثیت سے زیادہ دیر اس کے ہاں رہنے کو پسند نہیں کیا گیا۔ اس کو بے بس نہ کر دے کہ وہ کہے کل آپ کا قیام ہے یا کوچ؟ مہمان کہے قیام، تو میزبان کہے پھر ہمارا تو کوچ ہے۔

تیسرے عام طور پر علماء کرام، خطباء عظام اور اس سے بڑھ کر لیڈروں اور پیران محترم کے ہاں یہ ہوتا ہے کہ دعوت دو آدمیوں کی ہوتی ہے اور یہ بتائے بغیر دس بارہ آدمیوں کو ساتھ لیے میزبان کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ میرے ساتھ اگر آدمی زیادہ ہوں تو مجھے بتانا چاہیے کہ میرے ساتھ اتنے آدمی اور ہیں تا کہ میزبان اس کا انتظام کر لے۔ کوئی اگر دعوت دے کہ میرے ہاں چائے پی لیجئے گا اور یہ بیس آدمیوں کو لے کر پہنچ جائے تو اب میزبان نہ پلانے کا اور نہ چھوڑنے کا۔

ایک موقع کی بات ہے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند ساتھیوں سمیت کھانے کی دعوت کی، ایک اور آدمی بھی ساتھ ہو لیا تو گھر کے دروازے پر پہنچ کر حضورؐ نے میزبان سے کہا، دیکھو! یہ آدمی گنتی میں شامل نہیں ہے، از خود آ گیا ہے اب تمہاری مرضی ہے اس کو بٹھاؤ، تمہاری مرضی ہے نہ بٹھاؤ، ہماری وجہ سے تم پابند نہیں ہو۔ حالانکہ وہ حضورؐ کے ساتھ گیا تھا، میزبان نے کیا کہنا تھا، لیکن حضورؐ نے اصول بیان فرما دیا، مسئلہ بیان فرما دیا کہ جتنوں کی دعوت ہو، اتنے ہی جاؤ۔ اس نے کہا، یا رسول اللہ! آپ کے ساتھ آیا ہے یہ بھی کھانے میں شریک ہو جائے۔ آج کل ہمارے ہاں اس کی پرواہ نہیں کی جاتی، ہمیں تو سب گھر والوں کو کسی شادی پر جانے کے لیے ایک کارڈ کافی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ سے یہ قصہ سنا کہ وہ کہیں سفر پر جا رہے تھے تو ایک آدمی نے دعوت دی کہ حضرت! گزرتے گزرتے چائے میرے ہاں پی لیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے سفر میں کچھ دیر رک جائیں گے چائے پی لیں گے۔ یہ جب پہنچے تو چار پانچ گاڑیاں تھیں اور اس بیچارے نے

چار پانچ آدمیوں کی چائے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ اب وہ فوری طور پر تیس آدمیوں کی چائے کا کیسے انتظام کرتا۔ اس نے بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کیا کہ حضرت جب پہنچے تو اس نے گاڑی میں ہی حضرت کو دوسو روپیہ پیش کیا کہ حضرت! میرے ہاں اتنے آدمی بٹھانے کی جگہ نہیں ہے آپ راستے میں کہیں ہوٹل سے چائے پی لیجیے گا۔

ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا کہ ایک دفعہ ایک دوست نے مجھے فون کیا کہ ہم کچھ دوست آرہے ہیں، شام کا کھانا آپ کے ہاں کھائیں گے۔ میں نے پوچھا کتنے آدمی ہیں؟ انہوں نے کہا ایک گاڑی کے آدمی ہیں۔ گاڑی میں عموماً زیادہ سے زیادہ پانچ آدمی ہوتے ہیں، میں نے پانچ چھ آدمیوں کا کھانا تیار کروالیا۔ شام کو جب گاڑی پہنچی تو وہ ویگن تھی جس میں اٹھارہ آدمی تھے۔ میں نے اسے کہا، اللہ کے بندے! بتا دینا تھا گاڑی کون سی ہے؟ وہ کہنے لگا، آپ نے پوچھ لینا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس وقت بازار سے کچھ نہ ملتا ہو تو کتنی پریشانی ہوتی۔ میزبان کو تنگ کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے۔

ایک لطیفہ پچھلے دنوں پڑھا تھا کہ ایک آدمی کو کسی نے دعوت دی تو وہ سارے گھر والوں کو لے کر پہنچ گیا۔ میزبان نے کہا، حیا نہیں آئی۔ مہمان نے کہا، اس کے پیپر تھے اس لیے نہیں آئی، گھر پر رہ کر تیاری کر رہی ہے، باقی ہم سب آگئے ہیں۔

حضرت جابرؓ کا دسترخوان

غزوۂ خندق کے موقع پر سارے صحابہؓ خندق کھود رہے تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق کھودنے میں مصروف تھے، کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا، کئی دن سے بھوکے تھے۔ ایک آدمی نے آکر عرض کیا یارسول اللہ! سخت بھوک لگی ہے کیا کروں؟ فرمایا برداشت کرو، صبر کرو۔ اس نے پیٹ سے کپڑا اٹھایا اور دکھایا کہ اس نے بھوک کے احساس کو روکنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا ہے۔ جب اس نے یہ کیا تو حضورؐ نے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹایا، آپؐ نے دو پتھر پیٹ پر باندھے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت جابرؓ کہتے ہیں مجھ سے برداشت نہ ہوا میرا گھر وہاں قریب ہی تھا۔ میں نے کہا یارسول اللہ! اجازت ہو تو میں گھر چکر لگا آؤں۔ آپؐ نے فرمایا جاؤ۔ میں گھر گیا اور جا کر

بیوی سے پوچھا گھر میں کوئی کھانے کی چیز ہے، حضورؐ سخت بھوک میں ہیں؟ اس نے کہا ایک بکری کا بچہ اور ایک صاع جَو ہوں گے اور تو کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے خود بکری کا بچہ ذبح کیا اور ان کی بیوی نے آٹا پیسا۔ بیوی سے کہا تم ہانڈی پکاؤ، میں حضورؐ کو بلا کر لاتا ہوں۔ ان کی بیوی نے کہا زیادہ سے زیادہ آٹھ دس آدمیوں کا کھانا ہوسکتا ہے، زیادہ آدمیوں کو دعوت نہ دیجیے گا۔ حضرت جابرؓ گئے اور حضورؐ کے کان میں کہا میں گھر گیا تھا تھوڑا بہت بندوبست کر کے آیا ہوں، آٹھ دس آدمیوں کا کھانا ہے آپ تشریف لے چلیں ساتھ آٹھ نو آدمیوں کو لے چلیں جا کر کھانا کھا لیں۔ لیکن حضورؐ سات آٹھ سو ساتھیوں کو بھوکا چھوڑ کر خود کھانا کھانے کیسے جا سکتے تھے؟ وہ کوئی عام لیڈر نہیں تھے کہ کہتے ابھی کھلاؤ اور باقی فریزر میں رکھ دو کل کام آئے گا۔

حضورؐ نے اعلان فرما دیا کہ جابرؓ نے دعوت کی ہے سب چلو، جتنے لوگ موجود تھے سب چل پڑے۔ حضرت جابرؓ پریشان ہوئے کہ کھانا آٹھ دس آدمیوں کا ہے وہ آٹھ سو آدمیوں کو کیسے پورا ہو گا۔ جب گھر کے قریب پہنچے تو ان کی بیوی نے دیکھ لیا کہ اتنے زیادہ آدمی جابرؓ ساتھ لا رہے ہیں تو اس نے سمجھا کہ جابرؓ نے بتایا نہیں ہو گا اس لیے حضورؐ سارے ساتھیوں سمیت آرہے ہیں۔ چنانچہ حضرت جابرؓ کو بلا کر کہا "بِکَ وَبِکَ" تیرے ساتھ یہ ہو، تیرے ساتھ وہ ہو، یہ کیا کر دیا، ان سب کو کون کھلائے گا؟ انہوں نے کہا اللہ کی بندی! مجھے مت کوسو، میں نے حضورؐ سے کہہ دیا تھا۔ بیوی نے پوچھا واقعی کہہ دیا تھا؟ انہوں نے کہا ہاں میں نے تو کہہ دیا تھا۔ بیوی کہنے لگی، پھر اللہ جانے اور اللہ کا رسول جانے، پھر کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمادیا ہنڈیا سے ڈھکن نہیں اٹھانا اور آٹے سے کپڑا نہیں اٹھانا۔ حضورؐ نے آٹے پر ہاتھ پھیرا، لعاب مَلا، ہنڈیا میں تھوک مبارک ڈالا، اور فرمایا پکاتے رہو، لوگ کھاتے رہیں۔ چنانچہ عصر تک کھانا پکتا رہا، لوگ کھاتے رہے۔ آٹھ سو آدمیوں نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ بعد میں دیکھا کہ ہنڈیا بھی ویسی کی ویسی ہے اور آٹا بھی ویسے کا ویسا ہے۔ یہ حضورؐ کا معجزہ تھا ہمارے لیے ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

میں نے آج یہ بیان کیا کہ حضورؐ نے مہمانی کے آداب بیان فرمائے ہیں، مہمان نوازی کا حکم دیا ہے، اور میزبان و مہمان دونوں کو ایک دوسرے کا خیال رکھنے کا بھی حکم دیا ہے، اور خود بھی جناب نبی کریمؐ مہمانوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔

حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کی مہمان نوازی

ایک واقعہ اور سنا دیتا ہوں جس کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔ حضورؐ کا عام معمول تھا کہ کوئی مسافر مہمان آ جاتا تو ازواج مطہراتؓ کے حجروں میں پیغام بھیجتے کہ کوئی چیز کھانے کو ہے؟ اگر ستو، کھجوریں، دودھ وغیرہ ہوتا تو وہ بھیج دیتے۔ ایک دفعہ کوئی مہمان آیا آپؐ نے پیغام بھیجا لیکن نو حجروں میں سے کسی گھر سے بھی مہمان کا کھانا نہیں نکلا۔ حضورؐ نے لوگوں سے کہا، میرا مہمان ہے کوئی اسے کھانا کھلا دے گا؟ ابوطلحہ انصاریؓ اٹھے اور کہا میں گھر چکر لگا کر آتا ہوں، ذرا دیکھ آؤں گھر میں کیا کچھ ہے۔ گھر تشریف لے گئے، اہلیہ محترمہ ام سُلیم سے کہا حضورؐ کا ایک مہمان ہے، گھر میں کوئی چیز کھانے کو ہے؟ اس نے کہا صرف ایک آدمی کا کھانا ہے، یا تم کھا لو، یا میں کھا لوں، یا بچوں کو کھلا دیں، یا مہمان کو کھلا دیں۔ اتنا کھانا ہے کہ ایک آدمی کا گزارا ہو جائے گا۔ ابوطلحہؓ نے کہا، حضورؐ کا مہمان ہے اس لیے بچوں کو تو بہلا پھسلا کر سلا دو۔ کھانا دستر خوان پر رکھ دینا۔ عرب مہمان نوازی کے اصولوں کے مطابق میزبان نے ساتھ بیٹھ کر کھانا ہوتا ہے، مہمان اکیلے کھانا نہیں کھاتا۔ تو اس میں مسئلہ یہ تھا کہ اگر ابوطلحہ کھانا کھاتے تو مہمان کیا کھاتا۔ اس کا حل یہ نکالا کہ کہا، میں مہمان کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ جاؤں گا، ایک آدھ لقمہ لوں گا تم چراغ ٹھیک کرنے کے بہانے چراغ بجھا دینا۔ میں اندھیرے میں منہ ہلاتا رہوں گا، مہمان تسلی سے کھانا کھا لے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور مہمان کو اس طریقے سے کھانا کھلایا۔ اللہ رب العزت کو ان کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ قرآن مجید میں انصارِ مدینہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا" **یؤثرون علٰی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ** " (سورہ الحشر ۹) دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھوک سے ہوں۔

مہمان کے سامان کا دھیان

حضورؐ ایک اور بات کا اہتمام بھی کرتے تھے کہ مہمان آتا تو آپؐ اس سے اس کی سواری کا پوچھا کرتے کہ اونٹ کہاں باندھا ہے؟ اس کو کچھ کھلایا پلایا ہے؟ حضرت عمرؓ کا بھی سختی سے یہ معمول تھا کہ قافلہ آتا تو بندوں کو جگہ دینے سے پہلے پوچھتے اونٹ کہاں کھڑے کیے ہیں؟ خچریں کدھر ہیں؟ ان کے پانی، گھاس کا انتظام کیا ہے؟ ایک مرتبہ ایک صاحب حضورؐ کے پاس آئے۔ حضورؐ نے پوچھا،

کہاں سے آئے ہو؟ بتایا، فلاں جگہ سے۔ دریافت فرمایا، اونٹ کہاں ہے؟ اس نے کہا، اللہ کے توکل پر باہر چھوڑ دیا ہے۔ فرمایا، پہلے اونٹ کو باندھو، پھر توکل کرو۔ آج کل اونٹ، خچر تو نہیں ہوتے، موٹر سائیکل یا گاڑی ہوتی ہے۔ اگر رات موٹر سائیکل باہر کھڑی رہ جائے تو ممکن ہے صبح نہ ملے، اس لیے مہمان کے حقوق میں یہ بھی ہے کہ اس کی سواری کو محفوظ جگہ مہیا کی جائے۔

بہرحال مہمان کی عزت، احترام، حسب موقع اس کا اکرام کرنا اور اس کی ضروریات کا خیال رکھنا اور اس کی سواری کا خیال رکھنا، ان سب باتوں کی رعایت کرنے کا حکم سیرتِ نبویؐ میں دیا گیا ہے۔

سیرۃ النبی ﷺ اور قیدیوں کے حقوق

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج ہماری نشست کا موضوع ہے ’’سیرۃ النبیؐ اور قیدیوں کے حقوق‘‘ کہ حضورؐ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا کرتے تھے۔ قیدی اس زمانے میں مختلف قسموں کے ہوتے تھے۔ ایک تو جنگی قیدی ہوتے تھے۔ جنگی قیدیوں کے بارے میں قرآن کریم نے مختلف صورتیں بیان فرمائی ہیں اور حضورؐ نے بھی ان کے بارے میں وہ صورتیں اختیار کی تھیں۔

مثلاً قرآن کریم میں جنگی قیدیوں کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے **’’فامّا منا بعد و امّا فداءً حتیٰ تضع الحرب اوزارھا‘‘** (سورہ محمد ۴)۔ جنگی قیدیوں کے بارے میں چار پانچ آپشن ہوتے تھے (۱) قتل کر دیتے تھے (۲) ویسے چھوڑ دیتے تھے (۳) فدیہ لے کر چھوڑ دیتے تھے (۴) قیدیوں کا تبادلہ کر لیتے تھے (۵) یا غلام بنا لیتے تھے۔ حالات کے تحت جو مناسب ہوتا آپؐ ان سے معاملہ فرماتے۔

غزوہ بدر کے قیدی

سب سے پہلے یہ مسئلہ بدر کے موقع پر پیش آیا تھا، اس وقت حضورؐ نے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے؟ آپؐ کا معمول یہ تھا کہ جس معاملے میں وحی نہیں آتی تھی آپ صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا مشورہ قتل کرنے کا تھا کہ اس دور میں جنگی قیدیوں کو قتل کرنے کا رواج بھی تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ انہیں قتل نہیں کرنا چاہیے بلکہ فدیہ لے کر چھوڑ دینا چاہیے، ایک تو ہمیں ان کے فدیہ سے کچھ فائدہ ہو جائے گا اور دوسرے ان پر احسان ہو جائے گا، ہوسکتا ہے بعد میں مسلمان ہو جائیں۔ چنانچہ ان میں سے اکثر مسلمان ہو گئے تھے۔ آپؐ نے حضرت صدیق کی

رائے کے مطابق فدیہ لے کر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ ایسے کیوں کیا؟ عمرؓ کی رائے ٹھیک تھی، اب فیصلہ ہوگیا ہے تو ٹھیک ہے لیکن ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ فرمایا"**ما کان لنبی ان یکون له اسریٰ حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللّٰه یرید الاخرة**" (سورہ الانفال ۶۷)۔ اس لہجے میں بات اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں، فرمایا کہ دنیا کے چند پیسوں کے لیے قیدی چھوڑ دیے، عمرؓ کی بات کیوں نہیں مانی؟ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی کہ ان کو قتل کرنا چاہیے تھا۔

غزوہ حنین کے قیدی

حنین کے موقع پر جنگی قیدیوں کو ویسے ہی چھوڑ دیا گیا۔ حنین کی جنگ میں بنو ہوازن کو شکست ہوئی تھی، بہت سے قیدی اور مال غنیمت میں ملا۔ آپؐ نے قیدی اور مال غنیمت فوراً تقسیم نہیں کیے بلکہ انتظار کرتے رہے کہ اگر بنو ہوازن والے ایمان لے آتے ہیں تو ان کو قیدی اور مال واپس کر دیں گے۔ سترہ دن انتظار کرتے رہے، وہ نہیں آئے تو حضورؐ نے قیدی اور مال و دولت، سونا چاندی وغیرہ تقسیم کر دیا۔ تقسیم کر دینے کے اگلے دن بنو ہوازن کا وفد آیا اور کہا یارسول اللہ! ہم توبہ کرنے اور ایمان قبول کرنے آئے ہیں۔ مہربانی کر کے ہمارے قیدی اور ہمارا مال ہمیں واپس کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا، میں نے سترہ دن تمہارا انتظار کیا تم نہیں آئے تو اب میں نے تقسیم کر دیے ہیں` تقسیم سے پہلے اختیار میرا تھا، تقسیم کے بعد جن کی ملکیت ہو چکی ہے اختیار ان کا ہے۔ اب ان سے پوچھنا پڑے گا کہ واپس کرتے ہیں یا نہیں۔ لیکن تم آئے ہو تو تمہیں خالی واپس بھی نہیں بھیجتا، میں ان سے بات کرتا ہوں۔ تم ایک چیز اختیار کر لو، یا قیدی واپس لے لو یا مال واپس لے لو، دونوں چیزیں واپس نہیں ملیں گی۔ انہوں نے کہا اگر دونوں چیزیں واپس نہیں کرتے تو پھر ایسے کریں کہ ہمیں قیدی واپس کر دیں، مال واپس نہ کریں۔ آپؐ نے فرمایا جن کی وہ ملکیت ہو چکی ہے، میں ان سے پوچھوں گا۔

چنانچہ آپؐ نے لشکر اکٹھا کر لیا، بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ فرمایا، یہ تمہارے بھائی توبہ کر کے ایمان قبول کرنے آئے ہیں، میں ان کا انتظار کرتا رہا ہوں، یہ وقت پر نہیں آئے، اب میں نے ان سے

وعدہ کرلیا ہے کہ ایک چیز واپس کروں گا، ان کا کہنا ہے کہ قیدی واپس کر دیں، لیکن قیدی اب تمہاری ملکیت ہو چکے ہیں، تم قیدی خوشی سے واپس کر دو تو تمہاری مرضی اور اگر نہیں جی چاہتا تو واپس تو کر دو، میرے ذمے قرضہ رہا، اگلی جنگوں میں پہلے تمہارے قیدی ادا کروں گا پھر تقسیم کروں گا۔ لشکر سے آواز آئی یارسول اللہ! ہم راضی ہیں، خوشی سے واپس کرتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا، اس طرح تمہاری رضا، عدم رضا کا صحیح پتہ نہیں چل سکتا کہ سارے راضی ہیں یا نہیں ہیں۔ اپنے خیموں میں جاؤ، تمہارے نمائندے رات کو تم سے بات کریں گے اور مجھے صبح بتائیں گے کہ کون راضی ہے اور کون راضی نہیں ہے، تب فیصلہ کروں گا۔ ساری رات مشورے چلتے رہے۔ صبح کو سب نمائندوں (عرفاء) نے عرض کیا یارسول اللہ! سب راضی ہیں، تب حضورؐ نے فیصلہ کیا اور ان قیدیوں کو غلاموں اور لونڈیوں کو بلا کسی معاوضہ کے واپس کر دیا۔

غزوہ مریسیع کے قیدی

بنو مصطلق کے قیدیوں کو بھی ویسے ہی آزاد کر دیا گیا تھا۔ غزوہ مریسیع میں جنگی قیدی آئے تو ان کی آزادی کا سبب یہ بن گیا کہ حضورؐ نے اپنے حصے میں آنی والی باندی حضرت جویریہ بنت الحارثؓ جو کہ سردار کی بیٹی تھیں، کو آزاد کر کے ان سے نکاح فرما لیا تو صحابہ کرامؓ نے کہا، اب تو یہ خاندان حضورؐ کا سسرالی خاندان بن گیا ہے، اس لیے ہم سب کو آزاد کرتے ہیں، حضورؐ کے سسرال کو گرفتار رکھنا مناسب نہیں ہے، سب نے قیدی ویسے ہی چھوڑ دیے۔

قیدیوں کا تبادلہ

آپؐ نے جنگی قیدیوں کا تبادلہ بھی کیا ہے، اس پر ایک واقعہ نقل کرتا ہوں۔ ابوداؤد میں روایت ہے کہ کسی جنگ میں ایک بڑی خوبصورت لونڈی قیدی بن کر آ گئی، عرب کی خوبصورت ترین لڑکیوں میں سے تھی جو حضرت سلمہ بن الاکوعؓ کے حصے میں آئی۔ جناب نبی کریمؐ نے ان سے کہا کہ یہ لونڈی مجھے دے دیں، میں اس کے بدلے اور دے دوں گا۔ وہ حیران کہ لونڈی میرے حصے میں آئی ہے حضورؐ فرما رہے ہیں کہ مجھے دے دو، حضورؐ یہ کیوں مانگ رہے ہیں؟ بہر حال انہوں نے دے دی۔ آپؐ نے وہ لونڈی سنبھال کر رکھی، جس قبیلے کی وہ لڑکی تھی اس قبیلے کے پاس حضورؐ کے کافی

سارے آدمی قید تھے، حضورؐ نے اس لونڈی کے ساتھ اپنے قیدیوں کا تبادلہ کروایا کہ ہمارے قیدی واپس کردو اور اپنی لڑکی واپس لے لو، اب صحابہؓ کو سمجھ آئی کہ حضورؐ نے یہ لڑکی کیوں مانگی تھی۔

قیدیوں کیلئے پناہ

جنگی قیدیوں کے بارے میں حضورؐ کا یہ معمول رہا ہے۔ غزوۂ بدر کے قیدیوں میں حضورؐ کے داماد ابوالعاص بن ربیع تھے جو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے، حضرت خدیجہؓ اُن کی خالہ بھی تھیں اور ساس بھی، حضرت زینبؓ کے خاوند تھے، قید ہو کر آ گئے تھے۔ بخاری شریف میں ان کا قصہ ہے کہ جب حضرت زینبؓ کو پتہ چلا کہ میرا خاوند گرفتار ہو گیا ہے اور فدیہ کا فیصلہ ہو گیا ہے، اور اس غریب کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، تو انہوں نے اپنا ہار خفیہ طریقے سے بھجوایا کہ ابوالعاص کو یہ دے دو کہ فدیہ دے کر آزاد ہو جائے۔ اس وقت تک مسلمان اور غیر مسلموں کے نکاح قائم تھے، اس وقت حضرت زینبؓ مدینہ میں ابا جانؐ کے گھر پر تھیں۔ ابوالعاصؓ نے جب وہ ہار حضورؐ کو دیا تو آپؐ پہچان گئے کہ زینبؓ نے اپنا ہار اپنے خاوند کو چھڑانے کے لیے بھیجا ہے۔ ہار دراصل حضرت خدیجہؓ کا تھا جو انہوں نے اپنی بیٹی کو شادی کے موقع پر تحفہ میں دیا تھا۔ حضورؐ نے جب حضرت خدیجہؓ کا ہار دیکھا تو صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ یہ بیٹی کے پاس ماں کی نشانی ہے، اگر اجازت ہو تو واپس کر دوں؟ حضورؐ ویسے سوال نہیں کیا کرتے تھے لیکن یہاں یہ بات کی، صحابہ کرامؓ نے کہا جیسے آپ کی رضا۔ چنانچہ وہ ہار حضرت زینبؓ کو واپس کر دیا گیا۔

ابوالعاص بن ربیع ایک اور موقع پر بھی قیدی بن کر آئے۔ حضورؐ کا معمول یہ تھا کہ قیدیوں کو مسجد کے ستون سے باندھ دیتے تھے، کوئی قید خانہ تو تھا نہیں۔ اس سے ایک مقصد تو یہ ہوتا تھا کہ ایک دو دن یہ ہمارا ماحول دیکھ لے، ہم اسے دیکھ لیں، پھر فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔ چنانچہ ابوالعاص کو مسجد کے ستون سے باندھ دیا گیا۔ حضرت زینبؓ وہیں تھیں، ان کو علم ہوا کہ میرا خاوند پھر قیدی بن کر آ گیا ہے، ستون سے بندھا ہوا ہے اور صبح نماز کے بعد اس کے بارے میں فیصلہ ہونا ہے۔ حضورؐ نے اعلان یہ فرما رکھا تھا کہ کسی کافر کو عام آدمی بھی اگر پناہ دے دے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ حضرت زینبؓ چپکے سے فجر کی نماز کے وقت آئیں، نماز ہو رہی تھی، انتظار میں دروازے پر کھڑی ہو

گئیں، حضورؐ نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف متوجہ ہوئے تو زینبؓ نے کہا، اس قیدی کو میں نے پناہ دے دی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، ”**قد اجرنا من اجرت**“ جسے تو نے پناہ دے دی ہے اسے ہم نے بھی پناہ دی۔ اس طرح ابوالعاص کو دوبارہ چھوڑ دیا گیا۔ دلیر اور بہادر آدمی تھے۔ دلیر آدمی دلیر ہی ہوتا ہے چاہے کفر میں ہو یا اسلام میں۔ جب ان کو چھوڑ دیا گیا تو یہ چپکے سے مکہ چلے گئے، مکہ جا کر حرم میں کھڑے ہو کر مشرکین مکہ کے سامنے اعلان کیا کہ میں ابوالعاص ہوں، میں قیدی تھا، اب آزاد ہو کر واپس آ گیا ہوں، میں نے مسلمانوں کے اخلاق و عادات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ وہیں کر لیا تھا لیکن میں یہ الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا کہ قیدی بن کر اسلام قبول کیا ہے، میں تمہارے سامنے کھڑے ہو کر اعلان کر رہا ہوں ”**اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمدًا رسول اللّٰہ**“ اور ساتھ یہ بھی کہا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اب میں مدینے واپس جا رہا ہوں، جس میں ہمت ہے مجھے روک لے۔ بہادر آدمی کی یہ بات ہوتی ہے۔

آج میں نے سیرۃ النبیؐ اور قیدیوں کے حقوق، اور آپؐ کے قیدیوں کے ساتھ مختلف رویوں کے حوالے سے بات کی ہے۔

سیرۃ النبی ﷺ اور غلاموں کے حقوق

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب نبی کریمؐ سے پہلے بھی غلاموں کا سلسلہ جاری تھا، غلام جانوروں کی طرح خریدے اور بیچے جاتے تھے اور ان سے کام لیا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں تو یہ سلسلہ اسلام کے آغاز سے کچھ عرصہ بعد ہی کنٹرول ہو گیا تھا لیکن باقی دنیا میں یہ سلسلہ جاری رہا، مثلاً امریکہ میں اب سے ایک صدی پہلے ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء تک غلاموں کی منڈیاں لگتی تھیں اور انہیں خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ اب بھی لوگ خریدے بیچے جاتے ہیں لیکن اب اس کو غلامی نہیں، بردہ فروشی کہتے ہیں۔

دورِ نبویؐ میں غلامی کا رواج

جناب نبی کریمؐ کی بعثت کے وقت غلام کس طرح بنائے جاتے تھے؟ عام طور اس کے تین طریقے ہوتے تھے:

(۱) آزاد آدمی کی غلامی

ایک یہ کہ کسی بھی کمزور، بے سہارا، لاوارث آدمی کو کوئی بھی طاقتور آدمی پکڑ کر غلام بنا کر بیچ دیتا تھا اور وہ پھر جانوروں کی طرح بکتے بکاتے رہتے تھے۔ ہمارے دو بزرگ صحابی اسی طریقے سے غلام بنے تھے۔ حضرت زید بن حارثہؓ جو صرف صحابی نہیں بلکہ حضورؐ نے تو انہیں بیٹا بنا لیا تھا، لیکن اللہ نے قبول نہیں کیا، وہ واحد صحابی ہیں جن کا نام قرآن میں آیا ہے۔ اصلاً آزاد خاندان کے فرد تھے، راہ جاتے کہیں لوگوں نے پکڑا اور بیچ دیا، اس طرح غلام بن گئے۔ پھر بکتے بکاتے مکہ مکرمہ آ گئے، مکہ میں آنحضرتؐ کے حصے میں آئے اور حضورؐ نے آزاد کر دیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ بھی اسی طرح

غلام بنے۔ وہ بھی ایک آزاد خاندان کے فرد تھے، مذہب تبدیل کیا، گھر سے پناہ کی تلاش میں نکلے، راستے میں لوگوں نے پکڑا اور غلام بنا کر بیچ دیا۔ فرماتے ہیں کہ میں دس سے بھی زیادہ مالکوں کے ہاتھ بکتا بکتا مدینہ پہنچا، دس سے زیادہ مالکوں کی غلامی میں نے گزاری ہے۔ خیر ان دونوں صحابہ کے لیے تو غلامی خیر کا باعث بن گئی۔ حضرت زیدؓ غلام بنے تو اللہ تعالیٰ نے مکہ پہنچا دیا اور حضرت سلمانؓ کو بکتے بکاتے یثرب پہنچا دیا، وہ اس تلاش میں تھے کہ جناب نبی آخر الزمان آنے والے ہیں، میری ان سے ملاقات ہو جائے۔ ادھر سے اسی وقت نبی اکرمؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے، جب آپؐ قبا میں تھے اس وقت حضرت سلمانؓ ایک یہودی آقا کے غلام بن کر آئے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی توفیق دی اور وہ حضورؐ کی غلامی میں چلے گئے۔ اکثر لوگوں کو غلامی راس نہیں آتی لیکن ان کے لیے تو غلامی اللہ کی رحمت ثابت ہوئی، نعمت ثابت ہوئی۔ غلام نہ بنتے تو نہ معلوم یہاں تک پہنچتے یا نہ پہنچتے۔ بہرحال غلامی کا ایک سبب یہ تھا کہ کوئی طاقتور آدمی کسی بے سہارا کو پکڑ کر بیچ دیتا اور وہ بک کر غلام ہو جاتا تھا۔

(۲) تاوان اور قرضے کی غلامی

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کوئی آدمی تاوان یا قرضے میں پھنس گیا ہے، یا یا کوئی مالی ذمہ داری اس پر آ گئی ہے اور وہ ادا نہیں کر پا رہا اور قرض خواہ مجبور کر رہے ہیں تو یا تو وہ خود پیشکش کر دیتا تھا کہ مجھے بیچ کر اپنی قیمت پوری کر لو۔ یا عدالت، جرگہ، پنچائت فیصلہ کرتی تھی کہ یہ قرضہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور تم اپنے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہو تو ٹھیک ہے اس کو بیچ کر اپنا قرضہ پورا کر لو۔ یہ رواج حضورؐ کے زمانے بھی موجود تھا۔ اس پر ایک بڑا دلچسپ واقعہ ابوداؤد شریف میں مذکور ہے۔

حضرت بلالؓ مکہ مکرمہ میں امیہ بن خلف کے غلام تھے، حضرت صدیق اکبرؓ نے آزادی دلوائی تھی۔ ہجرت کر کے آئے تو مدینہ منورہ میں آزاد کردہ غلام تھے، حضورؐ کے ساتھی اور خادم تھے۔ آپؐ کے گھریلو معاملات کے ذمہ دار حضرت بلالؓ تھے۔ گھر کا خرچہ، غلہ، پانی، مہمانوں کا سنبھالنا، اس سب کی ذمہ داری حضرت بلالؓ پر تھی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ حضرت بلالؓ حضورؐ کے وزیر امور خانہ داری و

مہمانداری تھے۔ یہ معروف بات ہے کہ حضورؐ کے یہ معاملات حضرت بلالؓ کے ذمے تھے، حضرت بلالؓ کے پاس گھر کے لیے خرچہ موجود ہوتا تو کرتے رہتے ورنہ قرضہ لے لیتے تھے، خرچہ تو نہیں رکتا کرنا ہی پڑتا ہے، قرضہ لے کر خرچہ پورا کرتے۔ بعد میں حضورؐ کے پاس کوئی رقم آتی خمس وغیرہ کی تو اس سے قرضہ ادا ہو جاتا تھا۔ حضرت بلالؓ اور جناب نبی کریمؐ کا آپس میں یہ معاملہ چلتا رہتا۔

مدینہ منورہ کا ایک یہودی تھا، حضرت بلالؓ اکثر اس سے قرضہ لیتے تھے۔ اتفاق سے ایک دفعہ ایسا ہوا کہ قرضہ بڑھتے بڑھتے خاصا بڑھ گیا۔ اس یہودی نے کہا قرضہ واپس کرو۔ ان کے پاس گنجائش نہیں تھی۔ قرض خواہ نے ایک دن دھمکی دے دی کہ تین دن کے اندر اندر میرا قرضہ واپس کر دو ورنہ تمہارے گلے میں رسی ڈال دوں گا۔ اس زمانے میں گلے میں رسی ڈالنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تمہیں غلام بنا کر بیچ دوں گا اور اپنا قرض پورا کروں گا۔ حضرت بلالؓ بہت پریشان ہوئے کہ یہ رواج عرب میں عام تھا۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اس نے تو دھمکی دے دی ہے، لہٰذا آپ کچھ کریں۔ آپؐ نے فرمایا اس وقت تو میرے پاس گنجائش نہیں ہے۔ ایسے ہی تین دن گزر گئے، تیسرے دن اس نے پھر کہہ دیا کہ اگر آج رات تک میرے پیسے نہ ملے تو میں تمہارے گلے میں رسی ڈال دوں گا۔

اب پھر حضرت بلالؓ حضورؐ کی خدمت میں آئے کہ آج میرے گلے میں رسی پڑ جائے گی، میں ایک دفعہ غلامی بھگت چکا ہوں دوسری دفعہ غلام بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یا رسول اللہ! کوئی راستہ نکالیے۔ آپؐ کے پاس کوئی گنجائش نہیں تھی، کیا کرتے۔ حضرت بلالؓ نے کہا اچھا اگر انتظام آپ کے پاس بھی نہیں ہے اور میرے پاس بھی نہیں ہے اور اس نے کل صبح ہی مجھے غلام بنا لینا ہے اور بازار میں لے جا کر بیچ دینا ہے تو مجھے پھر ایک بات کی اجازت دیجیے کہ میں چپکے سے رات کہیں کھسک جاؤں، جب کہیں سے گنجائش ہو جائے گی تو آ جاؤں گا، حضورؐ نے اجازت عطا فرما دی۔

حضرت بلالؓ کہتے ہیں رات میں نے سونے سے پہلے سواری تیار کی، سفر کا سامان تیار کیا اور عشاء کے بعد تیاری کر کے لیٹ گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ آدھی رات کے بعد اٹھوں گا اور سفر شروع کر دوں گا، صبح ہوتے ہی میں دور کہیں پہنچ جاؤں گا۔ کہتے ہیں کہ میں سارا بندوبست کر کے ابھی لیٹا ہی تھا کہ کسی نے آواز دی بلال! رسول اللہؐ بلا رہے ہیں۔ کہتے ہیں میں اٹھا حضورؐ کی خدمت میں حاضر

ہوا، آپؐ مسجد کے باہر تشریف فرما تھے اور حضورؐ کے سامنے چار اونٹ ساز وسامان سمیت کھڑے تھے۔ ساز وسامان میں غلہ، کپڑے اور دیگر ضروریات کی چیزیں ہوتی تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا بلال دیکھو اس سے قرضہ پورا ہو جائے گا؟ میں نے اندازہ کیا اور کہا یا رسول اللہ! قرضہ بھی ادا ہو جائے گا اور کچھ بچ بھی جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا یہ فلاں قبیلے کے سردار نے مجھے ہدیہ بھیجے ہیں، ان سے قرضہ ادا کر دو اور اگر ان میں سے کچھ بچ گیا تو وہ میرے گھر نہیں لانا صدقہ کر دینا۔ حضرت بلالؓ کہتے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ نے میری جان بچالی ورنہ یا تو میں کہیں دور دراز نکل جاتا اور یا غلام بنا لیا جاتا۔ بہرحال غلام بنانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ تاوان اور قرضے میں سے غلام بنا کر بیچ دیا جاتا تھا۔

(۳) جنگی قیدیوں کی غلامی

غلام بنانے کا تیسرا طریقہ یہ تھا کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنایا جاتا۔ اس زمانے میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوتے تھے جنگی قیدیوں کے بارے میں تین چار آپشن ہوتے تھے:

(۱) انہیں قتل کر دیتے تھے

(۲) ویسے چھوڑ دیتے تھے

(۳) فدیہ لے کر چھوڑ دیتے تھے

(۴) یا قیدیوں کا تبادلہ کر لیتے تھے۔

قرآن کریم نے بھی مختلف آپشن ذکر کیے ہیں ”**فاما منا بعد واما فداءً حتیٰ تضع الحرب اوزارھا**“ (سورہ محمد ۴)۔

جنگ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑا گیا، ان کے بارے میں حضرت عمرؓ کا مشورہ قتل کرنے کا تھا، اس طرح کہ آپؐ اپنے چچا کو خود ماریں، ابوبکر اپنے بیٹے کو ماریں، میں اپنے ماموں کو ماروں۔ جس جس کا جو رشتہ دار ہے وہ خود اسے قتل کرے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کی رائے نرمی کرنے کی تھی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، تو آپؐ نے فدیہ لے کر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ ایسے کیوں کیا؟ عمرؓ کی رائے ٹھیک تھی۔ اب فیصلہ ہو گیا ہے تو ٹھیک

ہے لیکن ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ فرمایا "**ما کان لنبی ان یکون له اسریٰ حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللّٰہ یرید الاخرة**" (سورہ الانفال ٦٧)۔ اس لہجے میں بات اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں، فرمایا دنیا کے چار پیسوں کے لیے تم نے قیدی چھوڑ دیے۔ عمرؓ کی بات کیوں نہیں مانی؟ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی کہ ان کو قتل کرنا چاہیے تھا، فدیہ لے کر آزاد نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ایک آپشن یہ بھی تھا کہ قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ آج کل زیادہ تر جنگی قیدیوں کا تبادلہ ہی ہوتا ہے۔ اس پر ایک واقعہ نقل کرتا ہوں، ابوداؤد میں روایت ہے کہ کسی جنگ میں ایک خوبصورت لونڈی قیدی بن کر آ گئی جو حضرت سلمہ بن الاکوعؓ کے حصے میں آئی۔ جناب نبی کریمؐ نے ان سے کہا یہ لونڈی مجھے دے دو میں اس کے بدلے اور دے دوں گا۔ وہ حیران ہوئے کہ لونڈی میرے حصے میں آئی ہے اور حضورؐ فرما رہے ہیں کہ مجھے دے دو۔ بہرحال انہوں نے دے دی۔ آپؐ نے وہ لونڈی سنبھال کر رکھی، جس قبیلے کی وہ لڑکی تھی اس قبیلے کے پاس حضورؐ کے کچھ ساتھی قید تھے۔ حضورؐ نے اس لونڈی کے ساتھ اپنے قیدیوں کا تبادلہ کروایا کہ ہمارے قیدی واپس کر دو اور اپنی لڑکی واپس لے لو۔ عرب میں یہ سب رواج موجود تھے کہ قیدیوں کو یا قتل کر دیتے تھے یا ویسے چھوڑ دیتے تھے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیتے تھے یا تبادلہ کر لیتے تھے۔

ایک آپشن قتل کرنے کا بھی تھا جیسا کہ حضرت عمرؓ کی رائے تھی اور اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا قتل کرنے چاہیے تھے۔ اگر قیدیوں کو ویسے نہ چھوڑنا ہوتا، نہ فدیہ لے کر چھوڑنا ہوتا، نہ تبادلہ کرنا ہوتا، نہ قتل کرنا ہوتا تو جیل خانے تو ہوتے نہیں تھے، تو اب اتنے زیادہ قیدیوں کا کیا کریں، ان کو کہاں رکھیں؟ اس لیے یہ آپشن موجود تھا کہ ان کو تقسیم کر دیا جاتا تھا، یہ غلام اور باندیاں کہلاتے تھے اور بکتے تھے، خریدے جاتے تھے۔

مسئلہ غلامی اور اسلامی تعلیمات

مذکورہ بالا تین طریقے غلام بنانے کے تھے۔ حضورؐ نے یہ کیا کہ پہلے دو طریقے حرام قرار دے دیے۔ آزاد انسان کو بیچنے اور غلام بنانے کا طریقہ ممنوع قرار دیا اور فرمایا "**بیع الحر حرام، ثمن**

الحر حرام" کسی آزاد کو پکڑ کر بیچ دینے کو حضورؐ نے حرام قرار دے دیا۔ دوسرا طریقہ کہ تاوان میں کسی کو غلام بنالیا جائے اس کو بھی حضورؐ نے حرام قرار دے دیا۔ ویسے جو سزا چاہیں دیں لیکن تاوان میں غلام بنا کر بیچ دینا درست نہیں۔ یہ دونوں طریقے حرام قرار دیے۔ آپؐ کے اس اعلان کے بعد اس حوالے سے ہمارے ہاں نہ کوئی آدمی غلام بنا ہے اور نہ بکا ہے۔ جبکہ تیسرا طریقہ باقی رکھا، بطور حکم کے نہیں بلکہ مختلف آپشنز میں سے ایک آپشن کے طور پر۔ اس لیے کہ اس کی ضرورت تھی کیونکہ جنگی قیدیوں کو اکٹھا رکھنے کی صورت نہیں تھی اور انہیں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

جبکہ آپؐ نے غلاموں کے حقوق بیان فرمائے کہ یہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں "**اخوانکم**" تمہارے بھائی ہیں، آدم کی اولاد ہیں "**خولکم**" تمہارے خادم ہیں "**جعلهم اللّٰه تحت ایدیکم**" اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارا ماتحت بنا دیا ہے "**اطعموهم مما تطعمون والبسوهم مما تلبسون**" جو خود کھاتے ہو ان کو بھی وہی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو ان کو بھی وہی پہناؤ۔ ان کو اپنے برابر رکھو، ان کے ساتھ زیادتی نہ کرو "**ولا تکلفوهم بما لا یطیقون**" ان سے کام لو لیکن اگر کام ان کی ہمت سے زیادہ ہو تو پھر ان کے ساتھ کام میں معاونت کرو۔ ان سے اتنا ہی کام لو جتنا وہ کر سکیں۔

چنانچہ اسلام نے غلام بنانے کا آخری آپشن باقی رکھا ہے لیکن ان شرائط کے ساتھ۔ خود تو حضورؐ کا مزاج ہی اور تھا۔ حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں نے دس سال حضورؐ کی خدمت میں گزارے ہیں، میں نے حضورؐ کو کسی پر ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا، نہ بچے پر، نہ عورت پر، نہ غلام پر۔

حضورؐ کے سامنے ایک دفعہ ایک صحابی حضرت ابو مسعود انصاریؓ نے باندی کو تھپڑ مارا تو حضور کا طرز عمل کیا تھا؟ ابو مسعودؓ کہتے ہیں میری لونڈی بکریاں چرا رہی تھی کہ کچھ دیر وہ بے پرواہ ہوگئی۔ اس کی بے پرواہی سے بھیڑیا آیا اور ایک بکری لے گیا۔ ابو مسعود دیکھ رہے تھے، وہ لونڈی کے پاس گئے اور غصے میں اسے زور سے تھپڑ مارا اور کہا بے پرواہ بیٹھی ہوئی ہو، بھیڑیا بکری لے گیا ہے۔ جب زور سے تھپڑ مارا تو پیچھے سے آواز آئی۔ ابو مسعود اس کو تھپڑ مارنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ تم سے طاقتور بھی کوئی ہے جو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ کہنے والے رسول اللہؐ تھے۔ ذرا غور کریں کہ انہوں نے تھپڑ کس کو مارا تھا؟ نوکرانی کو، اور بے قصور بھی نہیں مارا تھا بلکہ غلطی کرنے

پر مارا تھا۔ پھر بھی حضورؐ ناراض ہوئے کہ اس کو کیوں مارا ہے۔ حضورؐ نے جب ڈانٹا تو ابو مسعودؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں، میں نے اپنی اس غلطی کے کفارے میں اللہ کے لیے اس لونڈی کو آزاد کیا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا، اگر تم اس کو آزاد نہ کرتے تو دوزخ میں جاتے "للفحتک النار" آگ تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی، اس تھپڑ کا صلہ یہی تھا کہ تم اسے آزاد کر دو۔ ایک تھپڑ جو کہ جرم کرنے پر مارا اس پر یہ وعید فرمائی۔ ہمارے ہاں تو نہ معلوم ماتحتوں کے ساتھ کیا کیا ہوتا ہے۔ ابھی چند سال پہلے گوجرانوالہ کچہری میں ایک کمی کو مار مار کر اس کا برا حال کر دیا گیا، اس بات پر کہ اس نے ایک چوہدری کو گزرتے ہوئے سلام کر دیا تھا کہ اس کی کیا جرأت کہ اس نے مجھے سلام کہا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا معمول یہ تھا کہ جیسے کپڑے خود پہنتے تھے ویسے ہی نوکروں کو پہناتے تھے۔ ایک دن آپؓ کے ایک دوست نے آپؓ سے کہا آپ نے جو اتنا قیمتی لباس پہنا ہوا ہے اسی کپڑے سے اپنے غلام کو پہنا رکھا ہے، اس کو کوئی ہلکی پھلکی چادر کافی تھی۔ فرمایا، نہیں بھئی! میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ تمہارے ماتحت ہیں "اطعموھم مما تطعمون والبسوھم مما تلبسون" جو خود کھاتے ہو ان کو بھی وہی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو ان کو بھی وہی پہناؤ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر کام نہ ڈالو۔ جتنا کر سکتے ہیں ان سے اتنا کام لو، اور اگر زیادہ کام اس کے ذمہ لگا دیا ہے اور تمہیں اندازہ ہے کہ یہ اکیلے نہیں کر سکے گا تو "اعینوھم" اس کے ساتھ مل کر کام کرو۔

غلامی آج کے دور میں

غلامی کا مسئلہ آج کی دنیا کا ایک بڑا مسئلہ ہے، جبکہ معروضی صورتحال یہ ہے کہ گزشتہ دو سو سال سے کسی جہاد میں ہم نے غلام یا لونڈی نہیں بنائے۔ جہاد فلسطین، جہاد کشمیر، جہاد افغانستان کسی میں بھی غلام اور لونڈی نہیں بنایا گیا۔ اقوام متحدہ کا ہم پر اعتراض یہ ہے کہ جب آپ نے غلامی کا سلسلہ ترک کر رکھا ہے تو قرآن کریم سے غلامی کے متعلق آیات نکالتے کیوں نہیں؟ حدیث میں غلامی کے ابواب کیوں پڑھاتے ہو؟ آپ کی فقہ کی کتابوں میں مکاتبت، تدبیر، استیلاد کے ابواب کیوں

پڑھائے جاتے ہیں؟ مجھ سے ایک مذاکرے میں یہ سوال ہوا کہ تم نے غلام بنانا کیوں چھوڑا ہوا ہے، اور اگر غلام بناتے نہیں تو یہ مسائل پڑھانا کیوں جاری رکھے ہوئے ہیں؟ میں نے کہا ہم نے غلام بنانا چھوڑ اس لیے دیا کہ یہ آنحضرت کا حکم نہیں تھا بلکہ مختلف آپشنز میں سے ایک آپشن تھا۔ بعض صورتوں میں اجازت دی تھی کہ اگر یہ کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ موجودہ حالات میں یہ موافق نہیں ہے اس لیے ہم تبادلہ والا آپشن اپنا لیتے ہیں۔ اور پڑھاتے اس لیے ہیں کہ یہ منسوخ نہیں ہوا، قرآن میں اس کے احکام موجود ہیں اور احادیث میں موجود ہیں تو اسے کون منسوخ کر سکتا ہے؟ تاکہ کل اگر پھر خدانخواستہ وہ حالات بن جائیں اس لیے پڑھانا بھی ضروری ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہم نے غلامی کے احکام نہ منسوخ کیے ہیں اور نہ ہم منسوخ کر سکتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے حکم، اور ایک ہوتا ہے حکم کا محل۔ وہ حکم جس ماحول کے لیے تھا اگر وہ ماحول دوبارہ آ گیا تو وہ حکم بھی قائم ہے، ماحول بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے۔

حالاتِ زمانہ اور اسلامی احکام

اس پر ایک مثال دوں گا، قرآن کریم نے صلوٰۃ الخوف کی جو تفصیل بیان کی ہے **"واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ"** (سورہ النساء ۱۰۲)۔ یہ قرآن کریم کا حکم اور جناب نبی کریمؐ کا عمل ہے لیکن آج کے دور میں میدان جنگ میں صلوٰۃ الخوف اس کیفیت میں نہیں پڑھیں گے جو قرآن کریم نے بیان کی ہے۔ آج اگر فوج کو مورچوں سے نکال کر اجتماعی صلوٰۃ الخوف کے لیے اکٹھا کریں گے تو یہ اجتماعی خودکشی ہوگی۔ اب جنگ کا ماحول بدل گیا ہے۔ اس زمانے میں صف بندی کی جنگ ہوتی تھی، اس میں نماز کی یہی ترتیب تھی۔ لیکن آج کل جنگ صف بندی میں نہیں مورچوں میں ہوتی ہے بلکہ اب تو مورچوں کی بھی نہیں رہی اب تو سنٹر میں بیٹھ کر جنگ ہوتی ہے اور کمپیوٹر کے ذریعے لڑائی کنٹرول کی جاتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کا حکم منسوخ ہو گیا ہے، حکم موجود ہے، حکم کا محل نہیں رہا۔ کل اگر دوبارہ صف بندی کی جنگ کا ماحول آ گیا تو صلوٰۃ الخوف کی وہی ترتیب ہوگی جو قرآن کریم نے بیان کی ہے۔ اسی طرح غلامی کا مسئلہ بھی ہے کہ ماحول بدلنے سے اس کی کیفیت بدل گئی ہے، کل اگر یہ معاہدات ختم ہو جاتے ہیں اور باقی

سارے آپشنز ختم ہو جاتے ہیں تو وہی حکم اپنا محل واپس آنے پر ویسے کا ویسا رہے گا اور غلام اور باندیاں بنائے جائیں گے، اس لیے ہم نے یہ پڑھنا پڑھانا ترک نہیں کیا۔

سیرۃ النبی ﷺ اور دعوتِ اسلام

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ سرورِ کائنات، فخرِ موجودات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت ملنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توحید اور دین کا پیغام پہنچانے کا حکم موصول ہونے کے بعد جب اپنی دعوت اور محنت کا آغاز کیا تو کہاں سے کیا اور کیسے کیا؟

اعلانِ نبوت کا حکم

حضورؐ کو حکم ملا "**فاصدع بما تؤمر**" (سورہ الحجر۹۴) جو کچھ آپ سے کہا گیا ہے اب اس کا اعلان کیجیے۔ تو آپؐ نے سب سے پہلے صفا پہاڑی سے عمومی دعوت کا آغاز کیا۔ آج تو صفا پہاڑی نہیں رہی بس اس کی علامت باقی ہے، اس زمانے میں پہاڑی ہوتی تھی اور اس دور کا رواج تھا کہ سفید چادر لہرا کر لوگوں کو بلاتے تھے، جو علامت ہوتی تھی کہ کوئی اہم واقعہ پیش آ گیا ہے۔ آپؐ نے اس پر چڑھ کر چادر لہرائی تو تھوڑی دیر میں مکہ کے کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ آپؐ نے ان سے سب سے پہلے اپنی ذات کے بارے میں بات کی، اس کے بعد دعوت کا باقاعدہ آغاز اس جملہ سے کیا "**یا ایھا الناس**"۔ یہ نقطہ آغاز ہے۔ جبکہ سامنے مکی، قریشی اور عرب لوگ تھے، شاید ہی کوئی عجمی ہو، لیکن جناب نبی کریمؐ نے ان حوالوں سے کسی کو خطاب نہیں کیا، بلکہ یوں فرمایا "اے نسل انسانی"۔ مطلب یہ کہ میں جو بات کہنے لگا ہوں یہ نہ صرف مکہ والوں کے لیے ہے، نہ صرف قریش والوں کے لیے ہے، اور نہ صرف عرب والوں کے لیے ہے، بلکہ ساری نسل انسانی کے لیے ہے۔

اسلام اور عالمگیریت

آج دنیا میں گلوبلائزیشن، انٹرنیشنلزم اور عالمگیریت کی بات ہوتی ہے اور بڑے لوگوں کے دعوے ہیں کہ ہم نے قوموں، ملکوں، نسلوں کے دائرے توڑ دیے، اب ہم ان کے اعتبار سے نہیں بلکہ انسانیت اور گلوبلائزیشن کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ میں ان سے کہا کرتا ہوں کہ آپ جس گلوبلائزیشن کی بات کرتے ہیں، نسلِ انسانی میں سب سے پہلے جس شخصیت نے گلوبلائزیشن کی بات کی ہے اس کا نام "محمد رسول اللّٰہ" ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ قوموں، ملکوں، زبانوں اور نسلوں سے ماورا پوری نسل انسانی کو جس نے سب سے پہلے خطاب کیا وہ آپؐ کی ذات گرامی ہے۔ آپؐ سے پہلے انبیاءؑ بھی، مصلحین بھی اور بادشاہ بھی قوموں سے ہی مخاطب ہوتے تھے لیکن "یا قوم، یا بنی اسرائیل اوریا ایها الملأ" ان کا عنوان ہوتا تھا۔ سب سے پہلے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "یـا ایهـا النـاس" سے خطاب کر کے یہ واضح کر دیا کہ میری دعوت نہ صرف مکہ والوں کے لیے ہے، نہ صرف قریش والوں کے لیے ہے، نہ صرف ہاشمیوں کے لیے ہے، اور نہ صرف عرب والوں کے لیے ہے، بلکہ ساری نسل انسانی کے لیے ہے۔

جب ہم اپنے ذہن کو اس بات پر تیار کر لیں کہ ہمارے دین کی دعوت پوری نسل انسانی کے لیے ہے تو پھر مجھے اور آپ کو سوچنا پڑے گا کہ اُس وقت حضورؐ نے پوری نسل انسانی کو مخاطب کیا تھا، آج نسل انسانی کہاں کہاں بستی ہے اور اسے "یـا ایها الناس" کہہ کر خطاب کرنے والا آج کون ہے؟ ہماری دعوت آج کیا ہے؟ ہم تو اپنی جماعت، قوم، طبقے، مسلک، علاقے اور فرقے سے مخاطب ہیں، ہماری کوشش اپنے مسلک کا دفاع کرنے کی ہوتی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ اپنے مذہب سے مخاطب ہوتے ہیں، اہل ایمان سے مخاطب ہوتے ہیں، ہم جتنا بھی دائرہ وسیع کر لیں ہمارا خطاب مسلمانوں سے ہی ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آج "ایهـا الـنـاس" کہنے والا کون ہے؟ یہ بھی کسی نے کہنا ہے یا نہیں؟ یہ کسی کی ذمہ داری ہے یا نہیں؟ میں خود کو اور آپ کو توجہ دلانے کے لیے بات کر رہا ہوں کہ مسلمان بھائیو! کہنے والے ہم سب ہیں، اپنی قوم، اپنے علاقے، اپنی نسل اور اپنی زبان والوں کو خطاب کر کے بات کرنے والے ہم سب ہیں، لیکن نسلِ انسانی کو خطاب کرنے والا دنیا

میں آج کون ہے؟ ہمیں سب سے پہلے یہ بات ذہنوں میں بٹھانی ہوگی کہ اسلام صرف مسلمانوں کا نہیں، پوری نسل انسانی کا ہے۔ قرآن کریم پر صرف ہمارا حق نہیں بلکہ یہ **"ھدًی للناس"** ہے، اس کی دعوت پوری نسل انسانی کے لیے ہے، سب کا اس پر حق ہے۔

جناب نبی کریمؐ نے جب **"ایھا الناس"** سے خطاب کیا تو آپ کے اردگرد مکہ اور طائف والے یعنی قریش اور بنوثقیف دو ہی طبقے تھے، تیسرے طبقہ یہود سے تیرہ سال بعد مدینہ میں واسطہ پیش آیا۔ ان دو ہی قبیلوں کا اعتراض تھا کہ **"وقالوا لو لا نزل ھذا القرآن علٰی رجل من القریتین عظیم"** (سورہ الزخرف ۳۱) آپ کہتے ہیں مجھے نبوت ملی ہے، اللہ نے اگر نبوت دینی تھی تو ان دونوں بستیوں مکہ اور طائف کے کسی بڑے سردار کو کیوں نہیں دی، آپ کو ہی کیوں دی ہے؟ یہ قرآن کریم آپ پر ہی اترنا تھا؟ بہرحال تیرہ سالہ مکی دور میں ان ہی دو طبقوں سے واسطہ رہا۔

قرآن کریم، دعوت کا اولین ذریعہ

رسول اللہؐ کی اس تیرہ سالہ دعوت کے مراحل کو دیکھیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضورؐ کی دعوت کا سب سے پہلا ذریعہ قرآن کریم تھا۔ چونکہ مخاطبین عرب تھے، عربی زبان جانتے تھے تو قرآن بھی عربی زبان میں اترا جو آپؐ کی دعوت کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ آپؐ منڈیوں اور تجارتی میلوں میں جا کر، خوشی غمی کے مواقع پر جا کر قرآن سناتے۔ قرآن کریم جو اللہ کا کلام ہے وہ جب حضورؐ سنائیں تو اثر کیوں نہ کرے؟ اس کے اثرات کو روکنا کیونکر ممکن ہوسکتا تھا۔ حضورؐ لوگوں کو قرآن کریم سناتے، اللہ تعالٰی کی توحید بیان کرتے اور اسلام کی دعوت دیتے۔ اس دعوت کے ردعمل میں آپ کے چچاؤں میں سے کوئی آپؐ کے پیچھے چل پڑتا۔

جب حضورؐ دعوت دیتے، اول تو یہ دعوت لوگوں کے لیے اجنبی ہوتی کیونکہ وہ صدیوں سے کفر و بت پرستی میں رہ رہے تھے، حضرت اسماعیلؑ کے بعد سے ان میں کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ان میں سے کوئی چچا لوگوں کو کہتا یہ میرا بھتیجا ہے اس کو جن چمٹ گیا ہے **"وقالوا مجنون وازدجر"** (سورہ القمر ۹) یہ مجنون ہوگیا ہے، اس کا دماغ کام نہیں کر رہا (نعوذ باللہ)، اس کی

باتوں پر نہ جانا، یہ ساحر و کاہن اور شاعر ہے، اس کو پتہ نہیں کس کی بد دعا لگ گئی ہے، لہٰذا اس کی بات سنجیدگی سے نہ سنیں۔

لیکن جب اس مرحلے میں کفار کو کامیابی نہ ہوئی اور حضورؐ کی دعوت قرآن کریم کے ذریعے پھیلتی رہی تو دوسرے مرحلے میں انہوں نے دعوت کو روکنے کے لیے قرآن کی محفلوں میں شور مچانے کی روش اختیار کی، کیونکہ جب کوئی حضورؐ کی زبان سے قرآن سنے گا تو متاثر ہوگا۔ اس لیے ان کا یہ ایجنڈا تھا کہ کوئی قرآن سنے ہی نہیں۔ "**وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھٰذا القرآن والغوا فیہ**" اس قرآن کو نہ سنو بلکہ جہاں قرآن پڑھا جارہا ہو وہاں شور مچاؤ تاکہ دوسرے بھی قرآن نہ سن سکیں "**لعلکم تغلبون**" (سورہ فصلت ۲۶) تاکہ تم ان کی بات روکنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ یہ پروپیگنڈا یہاں تک ہوا کہ لوگ کانوں میں انگلیاں دے کر مکہ مکرمہ آتے تھے کہ کہیں محمدؐ کی آواز اچانک کانوں میں نہ پڑ جائے اور انہیں کامیابی نہ ہو جائے۔ اس مرحلہ میں بھی کفار کو کامیابی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد یہ مرحلہ آیا "**ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللّٰہ**" (سورہ لقمان ۶) کہ کچھ لوگوں نے مثلاً نضر بن حارث وغیرہ نے مقابلے میں "**لھو الحدیث**" گانے بجانے، ناچ گانے اور قصے کہانیوں کی مجلسیں سجانا شروع کر دیں، جس کو میں یوں تعبیر کیا کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی دعوت کو روکنے کے لیے اور اس کے اثرات کم کرنے کے لیے انہوں نے مکہ میں ''کیبل'' بچھا دیا تاکہ حضورؐ کی طرف کوئی نہ جائے، سارے اسی مصروفیت میں لگے رہیں۔

جب اس مرحلہ میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو سودے بازی پر آ گئے، جب دیکھا کہ ہم روکنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تو مصالحت کا راستہ اختیار کیا۔ اسی مرحلے کے بارے میں قرآن کریم میں ہے "**ودّوا لو تدھن فیدھنون**" (سورہ القلم ۹) جناب ابوطالب کے پاس حضور اکرمؐ سے صلح کرنے کے لیے ستر سرداروں کا وفد آیا کہ جناب آپ ہماری ان سے صلح کرا دیں۔ ان کی پیشکش یہ تھی کہ ٹھیک ہے وہ بھی حرم پاک میں عبادت کریں، ہم بھی کرتے ہیں۔ ہم ان کو نہیں روکتے، وہ ہمیں نہ روکیں۔ حرمِ مکہ میں آپؐ عبادت کریں ہم بھی ان کے ساتھ مل کر کر لیا کریں گے اور کبھی

آپ ہمارے پاس آ جایا کریں، مل جل کر گزارہ کرتے ہیں۔ آپؐ جو چاہیں کریں ہم ان کو نہیں روکتے لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ آپؐ ہمارے خداؤں کی نفی نہ کریں۔ توحید کی بات ضرور کریں لیکن ہمارے بتوں کی نفی نہ کریں یعنی آج کی اصطلاح میں ''پازیٹو بات کریں، نیگیٹو نہ کریں''۔

پازیٹو اور نیگیٹو کا جھانسہ

آج بھی بین الاقوامی مکالموں میں یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ مسلمان پازیٹو بات کریں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، جب نیگیٹو بات کرتے ہیں تو ہمیں اشکال ہوتا ہے۔ مسلمان یہ کہیں کہ اسلام بہت اچھا مذہب ہے ہمیں کوئی اشکال نہیں، لیکن یہ نہ کہیں کہ عیسائیت صحیح مذہب نہیں ہے، اس سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔ مسلمان اسلام کی دعوت دیں لیکن یہودیت، ہندومت اور دیگر مذاہب کی نفی نہ کریں۔ ایک دفعہ مذاکرے میں مجھ سے سوال کیا گیا کہ مولانا! کیا اس میں کچھ لچک ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا ہم کیا لچک کریں گے ہمارے کلمہ کا پہلا لفظ ہی نیگیٹو ہے یعنی ''لا الٰـہ''۔ پازیٹو کا ذکر تو بعد میں آتا ہے یعنی ''الا اللّٰہ'' ہمارا سبق شروع ہی لاءِ نفی جنس سے ہوتا ہے جو ہر چیز کی نفی کر دیتا ہے، ہم کیسے لچک کر سکتے ہیں؟ سیرت وحدیث اور تاریخ کی کتابوں میں آپ کو ملے گا کہ مشرکین مکہ کا یہی مطالبہ تھا کہ آپ اللہ کی بات کریں اور اس کی عبادت کریں لیکن ہمارے بتوں کی نفی نہ کریں۔ یعنی ''لا الٰـہ'' کی بات نہ کریں ''الا اللّٰـہ'' کی بات کرتے رہیں۔ حضورؐ نے بلکہ قرآن مجید نے یہ پیشکش مسترد کر دی اور اسی کے جواب میں سورۃ الکافرون نازل ہوئی جس میں فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا، بارگیننگ نہیں چلے گی، تم نہیں مانتے تو نہ مانو۔

قرآن کریم میں ردوبدل کا مطالبہ

قرآن کریم نے ایک اور بھی دلچسپ بات ذکر کی ہے، جب آپؐ لوگوں کو قرآن کریم سناتے تو ایک موقع پر کفار نے یہ پیشکش کی کہ ٹھیک ہے ہم قرآن کو مانتے ہیں لیکن آپ یہ کریں کہ قرآن میں کچھ ترمیم اور ردوبدل کر دیں۔ قرآن مجید میں ہے ''**واذا تتلٰی علیھم آیاتنا بینات قال الذین لا یرجون لقآئنا ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ**'' جب ان کو قرآن سنایا جاتا ہے تو جن کا آخرت پر یقین نہیں وہ کہتے ہیں کہ یا تو پورا قرآن بدل دیں ''**اِئت بقرآن غیر ھذا**'' اس

کی جگہ کوئی اور قرآن لائیں کہ اس قرآن کے احکام بڑے سخت ہیں، اس لیے یہ قابل قبول نہیں، ورنہ کچھ ترامیم تو ضرور کریں "او بدلہ"۔ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ یہ مسئلہ قیامت تک چلنا ہے، اس لیے اس کا جواب بھی حضورؐ کی زبانی قرآن کریم میں دلوا دیا۔ ہمیں زحمت نہیں دی کہ ہم سوچیں کیا جواب دینا ہے۔ جواب یہ دیا "قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقآء نفسی" آپ کہہ دیجیے کہ مجھے سرے سے اس میں ردوبدل کا کوئی اختیار ہی نہیں، اللہ چاہے تو بدل دے کہ وحی جاری تھی، مگر میں اس میں ایک حرف کا ردوبدل بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا اتنا جواب ہی کافی تھا لیکن اس جواب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تاکید کے لیے اگلا جملہ بھی ساتھ کہلوا دیا "ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ" اس میں حصر ہے کہ میں تو صرف اور صرف وحی کا پابند ہوں، اور اس کے بعد ایک جملہ اور بڑھا دیا "انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم" (سورہ یونس ۱۵) کہ مجھے ڈر لگتا ہے اگر خدانخواستہ مجھ سے یہ کام ہو گیا تو قیامت کے دن کے عذاب سے مجھے کون بچائے گا؟

ردوبدل کی اتھارٹی کون؟

یہ ترمیم اور ردوبدل کا مطالبہ آج بھی چلتا رہتا ہے۔ بعض دانشور حضرات کے ساتھ گفتگو ہوتی ہے، کچھ عرصہ پہلے ایک گفتگو میں ایک صاحب فرمانے لگے کہ مولوی صاحب! کچھ تو کرنا ہی پڑے گا، عالمی برادری کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کے لیے کوئی بات تو ماننا ہی پڑے گی، اس کے بغیر تو ہم عالمی برادری کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو سکتے۔ جب انہوں نے بات مکمل کر لی تو میں نے کہا جناب! ٹھیک ہے پہلے ہم ایجنڈا بنا لیتے ہیں کہ آج کی دنیا کے مطالبات پورے کرنے کے لیے ہمیں کہاں کہاں اور کیا کیا ترامیم کرنی ہیں؟ اس کی تیاری میں آپ کے ساتھ شریک ہوں گا بلکہ آپ سے اچھا مسودہ بنا لوں گا کہ کہاں کہاں ترمیم کرنی پڑے گی۔ مثلاً مغرب کا مطالبہ ہے عورت کو طلاق کا برابر کا حق دو اور مرد و عورت میں کوئی فرق نہ کرو۔ اب عورت کو طلاق کا حق دینے کے لیے ترمیم کہاں کرنا ہو گی؟ ہدایہ کی عبارت میں؟ کسی امام کے قول میں؟ نہیں! بلکہ نعوذ باللہ یہ ترمیم قرآن کریم میں کرنا ہو گی۔ اس لیے ترمیم کہاں کہاں ہونی چاہیے، پہلے اس کی فہرست بناتے ہیں، لیکن ترمیم کرنی کس نے ہے؟ ہم کس کو درخواست دیں گے کہ جناب ترمیم کر دیں۔ اقوام متحدہ کی

جنرل اسمبلی کو درخواست دینی ہے، پاکستان کی قومی اسمبلی کو دینی ہے، یا کسی جرگے کو دینی ہے؟ درخواست دینی کہاں ہے؟ ردوبدل کی اتھارٹی تم بتادو فہرست میں بنا دیتا ہوں۔

بہرحال حضورؐ کی دعوت میں اس فرمائش کا مرحلہ بھی آیا کہ قرآن میں ترمیم کریں۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا یہ میرے اختیار میں ہی نہیں ہے، میں یہ کر ہی نہیں سکتا، اگر کروں گا تو مجھے **"عذاب یوم عظیم"** کا خطرہ ہے۔ جبکہ اگلی آیت میں فرمایا **"قل لو شاء اللّٰہ ما تلوتہ علیکم ولا ادراکم بہ"** (سورہ یونس ۱۶) فرمادیں یہ ہوسکتا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو میں تمہیں پڑھ کر نہ سناؤں، لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ پڑھ کر اس میں کوئی ترمیم کردوں۔

مصائب وتشدد کے مراحل

میں تیرہ سالہ مکی دور میں دعوت کے مراحل کا خاکہ آپ حضرات کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد وہ آخری مرحلہ آیا جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے، جب آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ پر مظالم کی انتہا ہوگئی اور تین سال شعب ابی طالب میں محصور رہنا پڑا، حضورؐ نے طائف کا سفر بھی اس غرض سے کیا کہ یہاں کا ماحول سازگار نہیں ہے، شاید طائف والے بات مان لیں لیکن وہاں سے لہولہان واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد یہ مرحلہ آیا **"واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک ویمکرون ویمکر اللّٰہ"** (سورہ الانفال ۳۰)۔

اوس اور خزرج کی دعوت

آزمائش کے ان مراحل کے بعد اللہ تعالیٰ نے جب دعوت کا راستہ کھولا تو کیسے کھولا؟ انصار مدینہ کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج، ان کی آپس میں ایک صدی تک لڑائی جاری رہی جس میں سینکڑوں لوگ قتل ہوئے۔ لڑائی سے تنگ آکر چند بوڑھے مل بیٹھے اور کہا کوئی صورت نکالو، کب تک ایک دوسرے کو مارتے مرتے رہو گے؟ لوگوں نے کہا ہم ایک دوسرے پر تو جمع نہیں ہوسکتے، قاتل ومقتول ایک دوسرے پر کیسے اکٹھے ہوسکتے ہیں؟ باہر کا کوئی آدمی مل جائے جو ہماری صلح کرا دے۔ ان کے نمائندے حج کے موسم میں مکہ آئے اور دیکھ رہے ہیں تھے ہمیں ہمارے کام کا کوئی آدمی مل جائے اور ہم اس سے درخواست کریں کہ ہمارے پاس آؤ اور ہماری صلح کرا دو۔ ادھر

جناب نبی کریمؐ کفار کے مظالم سے تنگ آ کر حاجیوں کے خیموں میں چکر لگا رہے تھے، دعوت دے رہے تھے اور تلاش کر رہے تھے کہ مجھے کہیں ٹھکانہ مل سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے منٰی میں دونوں کا اکٹھ فرما دیا۔ جہاں بیعت عقبہ اولیٰ ہوئی، بارہ آدمیوں نے بیعت کی، اگلے سال بیعت عقبہ ثانیہ ہوئی جس میں ستر آدمیوں نے بیعت کی۔ آپس میں خفیہ مذاکرات ہوئے، مدینہ والوں نے عرض کیا کہ حضور! آپ ہمارے ہاں تشریف لے آئیں۔ حضورؐ نے فرمایا، میں بھی جگہ کی تلاش میں ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا تو آ جاؤں گا۔ حضرت عائشہؓ اس واقعہ کو تفصیل سے بیان فرماتی ہیں۔

لطف کی بات یہ کہ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا، آپؐ کے ساتھ تھے۔ جب اوس وخزرج کے نمائندوں نے حضورؐ کو یثرب آنے کی دعوت دی اور کہا کہ ہم آپ کی حفاظت کریں گے، آپ کو ٹھکانہ مل جائے گا اور ہمیں رہنما مل جائے گا، دونوں کا کام چل جائے گا، تو حضرت عباسؓ کھڑے ہوئے اور کہا بات سنو! یہ ہمارا بھتیجا ہے اور ہم بنو ہاشم اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اگر تم میرے بھتیجے کو لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ لیکن یاد رکھو میرے بھتیجے کو ساتھ لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں پوری عرب دنیا سے لڑائی مول لینا ہوگی۔ اگر پورے عرب سے لڑائی مول لینے کا حوصلہ ہے تو آپؐ کو ساتھ لے جاؤ، ورنہ رہنے دو ہم ان کی حفاظت کر لیں گے۔ اس پر ان میں سے کچھ حضرات کھڑے ہوئے اور کہا ہم اپنی جانوں پر کھیل کر حضورؐ کی حفاظت کریں گے۔

بہر حال یہ معاہدہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دعوت کا نیا میدان دے دیا یعنی مدینہ منورہ۔ لیکن وہاں جانے کے بعد بھی چھ سال لڑائیوں میں گزرے، قریش نے چھ سال تک پیچھا نہیں چھوڑا۔ بدر، احد، خندق، حدیبیہ کے مراحل پیش آئے، اور حدیبیہ تک لڑائیاں چلتی رہیں۔ حدیبیہ کی صلح کے بعد دعوت کا میدان کھلا، اگرچہ حدیبیہ میں معاہدہ بظاہر کمزور شرطوں پر ہوا تھا، بہت سے مسلمانوں کو وہ شرائط ہضم نہیں ہو رہی تھیں مگر صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ کو موقع ملا اور آپؐ نے **"یا ایھا الناس"** کے دائرے میں دعوت شروع کی۔ اس سے پہلے تو مکہ والوں سے ہی الجھاؤ رہا۔ پھر آپؐ نے رومیوں، ایرانیوں، مصریوں، حبشیوں وغیرہ کو دعوت دی اور یہ دائرہ ایسا پھیلا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دعوت دنیا کی دو بڑی طاقتوں تک اور ان کے زیرِ اثر علاقوں تک پہنچا دی۔ ان میں سے ایک

مرحلے کا ذکر کرتا ہوں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ دین کی دعوت، دین کا پیغام، اللہ تعالیٰ کی توحید، قرآن کریم کا تعارف اور جناب نبی کریمؐ کی دعوت پوری نسل انسانی کا حق ہے، اس لیے جناب نبی کریمؐ کو جب کھلا ماحول ملا اور حالات سازگار ہوئے تو آپؐ نے دنیا بھر کو دعوت دی اور دعوت کا میدان ایسا وسیع ہوا کہ روم میں ابوسفیانؓ کی زبانی اسلام کی دعوت پہنچی جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ بخاری شریف میں یہ تفصیلی روایت موجود ہے، اس کا کچھ حصہ عرض کرتا ہوں۔

ہرقل قیصر روم اور حضرت سفیانؓ کا واقعہ

صلح حدیبیہ کے بعد جناب نبی کریمؐ نے مختلف بادشاہوں کے نام اسلام کی دعوت بھیجی۔ روم اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی، روم کے بادشاہ ہرقل قیصر روم کو بھی دعوت بھیجی۔ ہرقل اس وقت شام میں آیا ہوا تھا جو روم کا صوبہ تھا۔ ہرقل بیت المقدس میں موجود تھا جہاں اسے اسلام کی دعوت کا خط موصول ہوا۔ بڑے لوگوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ تحقیق کرتے ہیں کہ دعوت دینے والا کون ہے، اس کا تعارف پہلے حاصل کرتے ہیں، پھر اس کی دعوت کو دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جب حضورؐ کی طرف سے اس کو اسلام کی دعوت ملی تو اس نے کہا ان صاحب (حضورؐ) کے علاقے سے اگر کچھ لوگ آئے ہوئے ہوں تو مجھ سے ملاؤ تاکہ میں ان کے بارے میں تحقیق کروں کہ وہ کون ہیں اور ان کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ حضرت ابوسفیانؓ، جو بعد میں اسلام لائے، اس وقت حضورؐ کے حریف تھے اور عرب دنیا میں حضورؐ کے سب سے بڑے مدمقابل آپ ہی تھے۔ خندق کی لڑائی میں حضورؐ کے خلاف متحدہ محاذ کی قیادت ابوسفیانؓ نے کی تھی۔

ابوسفیانؓ شام میں موجود تھے، آپؓ حضورؐ کے چچا بھی لگتے تھے اور خسر بزرگوار بھی تھے۔ ابوسفیانؓ خود یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہرقل کے کارندے ہمارے پاس آئے اور پوچھا آپ مکہ سے آئے ہیں؟ ہم نے بتایا، ہاں۔ انہوں نے کہا بادشاہ سلامت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابوسفیانؓ کہتے ہیں ہم ہرقل کے دربار میں گئے، ہرقل اور اس کی پارلیمنٹ بیٹھی ہوئی تھی، ہم پیش ہوئے۔ ہرقل نے ہم سے آپؐ کا مکمل تعارف حاصل کیا کہ یہ مدعی نبوت کون ہیں؟ ان کا نسب کیسا

ہے؟ ان کا کردار کیسا ہے؟ بہت سے سوالات کیے، میں جواب دیتا رہا۔

سارا تعارف کر کے، تسلی کر کے آخر میں ہرقل نے ایک سوال کیا۔ ذرا منظر دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دعوت کے اسباب کیسے پیدا کیے کہ عالمی سطح پر دنیا کا سب سے بڑا حریف ہرقل سوال کر رہا ہے اور جزیرۃ العرب کے دائرے میں حضورؐ کا سب سے بڑا حریف جواب دے رہا ہے اور حضورؐ کا تعارف کرا رہا ہے۔ جب ہرقل نے سوال کیا "**ماذا یامرکم؟**" وہ تمھیں کیا کہتا ہے؟ اس کی دعوت کیا ہے؟ دنیا کے سب سے بڑے حکمران کے سامنے اس کے دربار میں حضورؐ کا جزیرۃ العرب کا سب سے بڑا حریف کھڑے ہو کر حضورؐ کی دعوت پہنچاتا ہے اور جواب دیتا ہے "**یامرنا ان نعبد اللّٰہ وحدہ ونترک ما کان یعبد اٰبائنا ویامرنا بالصلوٰۃ والصدق والصلۃ والعفاف**" اس کی دعوت یہ ہے کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں، اللہ کے سوا جن کی پوجا ہمارے آباء واجداد کرتے آ رہے ہیں سب کو چھوڑ دیں۔ ذرا دیکھیں توحید کہ دعوت کس کے سامنے کون بیان کر رہا ہے۔ پھر کہا کہ وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ نماز پڑھا کرو، سچ بولا کرو، اللہ کے رستے میں خرچ کیا کرو اور پاکدامن رہو۔ یہ اس کی بنیادی دعوت ہے۔

میں صرف اس نکتے پر توجہ دلا رہا ہوں کہ دین کی دعوت ہماری محتاج نہیں، اللہ جس کے ذریعے چاہے دعوت پہنچا دے۔ یہاں دیکھیں کہ کافر کو کافر دعوت پہنچا رہا ہے اور دعوت بھی بغیر کسی گڑبڑ کے صحیح پہنچا رہا ہے۔ ابوسفیانؓ واقعہ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہرقل نے مجھے میرے ساتھیوں سے آگے بٹھا لیا تھا اور میرے ساتھیوں کو میرے پیچھے بٹھا دیا تھا اور ان سے کہہ دیا تھا میں اس سے سوال کروں گا اگر یہ جواب میں گڑبڑ کرے تو مجھے اشارہ کر دینا۔ ابوسفیانؓ کہتے ہیں خدا کی قسم! اس اشارے کے ڈر سے میں ہر بات کا جواب سچ سچ بتاتا رہا، ورنہ بخدا میں کیا کیا جھوٹ بولتا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ میں قوم کا سردار ہوں اگر جھوٹ بولا تو میرا سارا بھرم تباہ ہو جائے گا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی بندوبست کروا لیا کہ حضورؐ کے دعوت پہنچے تو صحیح شکل میں پہنچے۔ پھر جناب نبی کریمؐ کی یہ دعوت دنیا کے کونے کونے میں پھیلی۔

''یاایھا الناس'' کی ذمہ داری

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ دعوت کا نقطہ آغاز ہی نسلِ انسانی ہے۔ ہم سبھی اپنے آپ کو اس دعوت کا وارث سمجھتے ہیں، اور نہ سمجھیں تب بھی ہم ہی اس دعوت کے وارث ہیں کیونکہ یہ امت کے ذمے ہے۔ اس وقت نسل انسانی میں سات ارب سے زیادہ انسان ہیں، ان سات ارب انسانوں تک ''**یا ایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ تفلحوا**'' کی صدا لگانا کس کی ذمہ داری ہے؟ ہم تو ابھی اپنے بھائیوں کو، جو ڈیڑھ پونے دو ارب ہیں، ان کو بھی کلمہ پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو رہے کہ ان کا کلمہ صحیح کرا لیں، نماز صحیح کرا لیں، ان کو قرآن پڑھا لیں تاکہ ہم دوسروں کو کہنے کے قابل ہو جائیں۔ لیکن یہ عبوری مرحلہ ہے، اصل ذمہ داری ہماری یہ ہے کہ ''**یا ایھا الناس**'' سے خطاب کریں اور یہ ہماری ہی ذمہ داری ہے، ہم نے ہی کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ احساس ہمارے دلوں میں پیدا کرے کہ ہم امت کی اجتماعی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور دعوت کے اس عمل میں جہاں جتنا حصہ ہم ڈال سکتے ہوں، ڈالیں۔ کم از کم یہ تو ہو کہ کچھ نہ کچھ کرنے والوں میں ہی ہمارا نام آ جائے، میں اسے اضعف الایمان سمجھتا ہوں۔ کرنا تو بہت کچھ چاہیے لیکن خدا کرے کچھ نہ کچھ کرنے والوں میں ہی ہمارا شمار ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ دعوت وتبلیغ کے عمل کو مزید ترقیات اور وسعتوں سے مالا مال فرمائیں۔ دعوت کا یہ عمل اصلاح کا عمل ہے، امت کو دین پر واپس لانے کا عمل ہے، نماز، روزہ، حلال وحرام اور جائز وناجائز کی تمیز کی طرف واپس آنے کا عمل ہے اور وہ اسلامی ماحول پیدا کرنے کا عمل ہے جو دنیا میں دین کی دعوت کی بنیاد بن سکے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔